مرضی صرف اللہ کی

خُدا تک کا سَفَر

Reclaim Your Heart

YASMIN MOGAHED

Scanned with CamScanner

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

176, Basement Ali Market,
Opposite Bible Society,
New Anarkali, Lahore.
whatsApp # 0300-4416761
Facebook: bookfaiir
www.khizarreaders.com

ذعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور فون 042-37233585

- الفتح نیوز ایجنسی، سکھر
- فوجی گلیکسی میلہ، پریس کلب، رحیم یار خاں
- ویلکم بک پورٹ، اُردو بازار، کراچی
- بھٹائی بک سیلر، کاری کھاتہ، حیدرآباد
- فقیر بک ایجنسی، قصہ خوانی بازار، پشاور
- اشرف بک ایجنسی، اقبال روڈ، راولپنڈی
- گوشۂ ادب جناح روڈ کوئٹہ
- فرید پبلشر اردو بازار کراچی
- حق پبلی کیشنز 2-A سید پلازہ، چیٹرجی روڈ، اُردو بازار لاہور
- مکتبہ اسلامیہ، امین پور بازار، فیصل آباد
- بکس اینڈ بکس، گلگشت کالونی، ملتان
- ظفر بک ڈپو، اُردو بازار، سرگودھا
- کارواں بک سنٹر، بہاولپور
- مکتبہ رضویہ، گول چوک، اوکاڑہ
- شاپ اینڈ سیو، سٹیلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ
- فکشن ہاؤس رابعہ اسکوائر حیدر چوک حیدرآباد
- بسم اللہ بک ہاؤس اردو بازار کراچی

خوبصورت اور معیاری کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں۔ معاذ ہاشمی 0300-4416761

یاسمین مجاہد

ترجمہ: عظیم احمد

"یاحیُّ یاقیّومُ برحمتِکَ اَستغیثُ"

ناشر	معاذ ہاشمی
اہتمام	سید حذیفہ حسن ہاشمی
مینیجر مارکیٹنگ	محمد عقیل باقر 0302-4380214
نام کتاب	صرف اللہ کی مرضی
مصنف	یاسمین مجاھد
مترجم	عظیم احمد
آرٹ ڈائریکٹر	مدثر وحید
سرورق	خواجہ افضل کمال
سن اشاعت	۲۰۲۰ء
قیمت	-/800 روپے
	ڈالر 10$

اللہ

انتساب ••

یہ کتاب سرتاسر نام ہے اس واحد کے جس نے ماں کی کوکھ میں میرے ظہور سے بھی پہلے
سے میری پرورش کی۔
نام ہے اس واحد کے جس نے پوری زندگی مجھے سکھایا، مجھے تحریک دی اور میری رہنمائی کی۔
میں اس عاجزانہ کوشش کو اپنے رب کے نام منسوب کرتی ہوں، اور میری دعا صرف یہی
ہے کہ میری کمزوری کے باوجود، اسے شرفِ قبولیت حاصل ہو،
اور اپنے خاندان کے نام جنہوں نے اس پورے سفر کے
دوران مجھے سپورٹ کیا۔

تعارف

یہ محض خود کو بہتر بنانے کے اصولوں پر مبنی کتاب نہیں۔ یہ اس زندگی کے سمندر میں اترنے اور پار جانے کے سفر کا ایک ہدایت نامہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ اپنے دل کو اس سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہونے سے کیسے بچانا ہے، اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر کیا کرنا ہے۔ یہ کتاب نجات کے بارے میں ہے، امید کے بارے میں ہے، تجدید کے بارے میں ہے۔ ہر دل کے زخم بھر سکتے ہیں، اور ہر لمحے کا مقصد ہمیں اس کایا کلپ کر دینے والی واپسی کے نزدیک لانا ہے۔ یہ کتاب اس لمحے کے بارے میں ہے جب ہر چیز رک جاتی ہے اور اچانک مختلف نظر آنے لگتی ہے۔ یہ اپنی بیداری حاصل کرنے، اور پھر اپنی شخصیت کے زیادہ بہتر، زیادہ سچے، اور زیادہ آزاد روپ کی طرف لوٹ جانے کے بارے میں ہے۔

حسنِ ترتیب
صرف اللہ کی رضا
Reclaim Your Heart

صرف اللہ کی مرضی
Reclaim Your Heart

وابستگیاں

لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کیوں ہونا پڑتا ہے؟

سترہ سال کی عمر میں، میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک مسجد کے اندر بیٹھی تھی اور ایک چھوٹی سی لڑکی ایک سوال پوچھنے کے لئے میرے پاس آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کیوں ہونا پڑتا ہے؟'' سوال ذاتی نوعیت کا تھا، لیکن میں بخوبی سمجھ رہی تھی کہ میرے لئے یہ سوال کیوں منتخب کیا گیا ہے۔

مجھے وابستگیاں اختیار کرنے کی عادت تھی۔

بچپن سے ہی میرے مزاج کی یہ خصوصیت بہت نمایاں تھی۔ پری سکول میں جب والدین ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو جاتے تھے تو دوسرے بچے جلد ہی سنبھل جاتے تھے، لیکن مجھ سے سنبھلا نہیں جاتا تھا۔ ایک دفعہ میرے آنسو بہنے لگتے تو آسانی سے رکتے نہیں تھے۔ بڑی ہوئی تو میں نے اپنے اردگرد کی ہر چیز سے جڑ جانا سیکھ لیا۔ پہلی جماعت سے ہی مجھے ایک ''سب سے اچھے'' دوست کی ضرورت پڑنے لگی۔ عمر کی منازل طے کرنے کے دوران، جب بھی کسی دوست سے میرا جھگڑا ہوتا تو میں بہت بری طرح سے متاثر ہوتی۔ لوگ، جگہیں، واقعات، تصاویر، لمحے، یہاں تک کہ نتائج کے ساتھ بھی میری گہری وابستگیاں قائم ہونے لگیں۔ اگر نتائج میری منشاء یا توقع کے مطابق نہ نکلتے تو میں بکھر کے رہ جاتی۔ اور مایوسی میرے لئے کوئی عام سا جذبہ نہ تھا۔ مجھ پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوتے۔ میں کبھی پوری طرح سے خود کو سمیٹ نہ پاتی۔ میں کبھی بھول جانے میں کامیاب نہ ہوتی اور میرے زخم ہمیشہ ہرے رہتے۔ میز کے کنارے پڑے کانچ کے برتن کی طرح، ایک دفعہ ٹوٹ جانے کے بعد، ٹکڑے دوبارہ کبھی پوری طرح سے جڑ نہ پاتے۔

تاہم، مسئلہ برتن کا نہ تھا بلکہ یہ بھی نہ تھا کہ اسے بار بار ٹوٹنا پڑتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں بار بار اسے میز کے کنارے پر رکھ دیتی تھی۔ اپنی ہر وابستگی کے دوران، اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مجھے اس رشتے پر تکیہ کرنا پڑتا تھا۔ میں ان رشتوں کو اپنی خوشی یا اپنے غم، اپنی تسکین یا

اپنی تشنگی، اپنے تحفظ، یہاں تک کہ اپنی ہی نگاہوں میں اپنی قدر و قیمت تک کا فیصلہ کرنے کی اجازت دیتی تھی۔ اور اس لئے، ایسے برتن کی طرح جو ایسی جگہ پر پڑا ہو جہاں سے اسے گرنا ہی گرنا ہو، ان آسروں پر تکیہ کر کے میں خود اپنی دل شکستگی کی راہ ہموار کرتی تھی۔ میں خود اپنے ٹوٹنے اور ٹوٹ کر بکھر جانے کا سامان پیدا کرتی تھی۔ اور میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا تھا: ایک کے بعد ایک مایوسی، ایک کے بعد ایک شکستگی۔

لیکن قصور ان لوگوں کا بھی نہ تھا جو مجھے توڑتے تھے، ان پر الزام دھرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کشش ثقل پر الزام دھرا جائے کہ برتن اس کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ ہم کسی کمزور شاخ کا سہارا لیں اور وہ ٹوٹ جائے تو ہم طبیعات کے قوانین کو اس کے لئے مورِدِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس شاخ میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ ہمارا بوجھ سہار سکتی۔

ہمارا بوجھ صرف ہمارے رب کو اٹھانا تھا۔ قرآن میں ہمیں بتایا گیا ہے:

''.....جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: ۲۵۶)

اس آیہ مبارکہ میں ایک نہایت اہم سبق پوشیدہ ہے: یہ کہ صرف ایک ہی ساتھ ہے جو کبھی چھوٹتا نہیں۔ ایک ہی ذات ہے جس پر ہم ہر حوالے سے تکیہ کر سکتے ہیں۔ ایک ہی تعلق ایسا ہے جسے ہماری خود توقیری کا تعین کرنا چاہئے اور ایک ہی وسیلہ ایسا ہے جس کے ذریعے ہمیں اپنی کامل خوشی، تسکین، اور تحفظ کی تلاش کرنی چاہئے۔ یہ ساتھ، یہ ذات، یہ تعلق، یہ وسیلہ ہمارے رب کا ہے۔

تاہم دنیا کا دستور کچھ ایسا ہے کہ ان چیزوں کے لئے اپنے رب سے رجوع کرنے کے بجائے ہم دربدر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ ان چیزوں کو اپنے کریئر میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ مال و دولت میں، اور کچھ مقام و مرتبے میں۔ کچھ مجھ جیسے لوگ ہیں جو انہیں اپنے رشتوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کتاب ''کھاؤ، عبادت کرو، محبت کرو'' (Eat, Pray, Love) میں الزبتھ گلبرٹ (Elizabeth Gilbert) اپنی

...و برائے مسرت کی کہانی بیان کرتی ہے۔ وہ رشتے بنانے اور توڑنے کے بارے میں اور تسکین قلب کی تلاش میں پوری دنیا کا سفر کرنے کے بارے میں بیان کرتی ہے۔ وہ اس تسکین کو اپنے رشتوں میں، مراقبے میں، یہاں تک کہ خور و نوش میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔

اور میں نے اپنی زیادہ تر زندگی بھی اسی انداز میں صرف کی: اپنے اندر کے خلا کو بھرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش میں۔ لہٰذا کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میرے خواب میں آنے والی ننھی لڑکی نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اس سوال کا تعلق زیاں سے، مایوسی سے تھا۔ اس سوال کا تعلق دوسروں کی طرف سے ناامید کئے جانے سے تھا۔ اس سوال کا تعلق کسی چیز کو تلاش کرنے اور خالی ہاتھ لوٹ آنے سے تھا۔ اس سوال کا تعلق اس امر سے تھا کہ جب آپ صرف اپنے ہاتھوں سے کنکریٹ کو کھودنے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے: آپ نہ صرف خالی ہاتھ رہتے ہیں بلکہ اس کوشش میں اپنی انگلیاں بھی تڑوا بیٹھتے ہیں۔ مجھے یہ سبق پڑھنے لکھنے سے یا کسی دانا کی باتیں سننے سے نہیں ملا، میں نے بار بار ایسا کرنے کی کوشش کے بعد اسے حاصل کیا۔

اور اس لئے، اس ننھی لڑکی کا سوال، بنیادی طور پر میرا اپنا سوال تھا...... جو مجھ سے ہی پوچھا جا رہا تھا۔

آخرالامر، یہ سوال اس دنیا کی فطرت کے بارے میں تھا جو اپنے آپ میں بے ثبات لمحوں اور عارضی وابستگیوں کی جگہ ہے۔ ایک ایسی جگہ ہے جہاں آج لوگ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں، اور کل آپ کو چھوڑ جاتے ہیں یا فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہمارے وجود کو ٹھیس پہنچاتی ہے کیونکہ یہ ہماری فطرت کے برعکس ہے۔ بطور انسان، ہمارے خمیر میں ہے کہ جستجو کریں، محبت کریں، اور کوئی کامل چیز، کوئی مستقل چیز حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے خمیر میں ہے کہ ہم کسی دائمی چیز کی تلاش میں رہیں۔ ہماری تلاش اس لئے ہے کیونکہ ہم اس دنیا کے لئے بنے ہی نہیں۔ ہمارا پہلا اور حقیقی گھر جنت تھی: ایک ایسی سرزمین جو کامل بھی ہے اور دائم بھی۔ اس لئے ایسی کسی زندگی کی تلاش ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اس دنیا میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس لئے خود کو سنبھالے رکھنے کی مجنونانہ

کوشش میں ہم عمر کم کرنے والی کریموں اور کاسمیٹک سرجری کا سہارا لیتے ہیں..... اس دنیا کو ایک ایسی جگہ بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو یہ ہے ہی نہیں، اور نہ کبھی ہوگی۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے قلوب کے ساتھ اس دنیا میں رہتے ہیں تو یہ ہمیں توڑ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا تکلیف دیتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی یہ تعریف، کہ یہ ایک عارضی اور ناقص جگہ ہے، ہماری ہر اس خواہش، ہر اس تڑپ کے برعکس ہے جسے ہمارے خمیر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اللہ نے ہم سب میں ایک ایسی پیاس ڈال دی ہے جس کی تسکین صرف کسی دائمی اور کامل چیز سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس بے ثبات دنیا میں تسکین تلاش کرنے کی کوشش، ایک سراب کے تعاقب کے مترادف ہے۔ ہم خالی ہاتھوں سے کنکریٹ میں گڑھا کھودنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو چیز اپنی فطرت میں عارضی ہے، اسے ہم ایک دائمی چیز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے آگ سے پانی کشید کرنے کی کوشش کی جائے۔ جھلساہٹ کے علاوہ اس سے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب ہم دنیا سے امیدیں وابستہ کرنا چھوڑ دیں گے، جب ہم دنیا کو ایک ایسا مقام (یعنی جنت) بنانے کی کوشش کرنا چھوڑ دیں گے جو کہ یہ بن ہی نہیں سکتی، صرف تب ہی یہ دنیا ہمارے دلوں پر چھریاں چلانے سے باز آئے گی۔

ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اس دنیا میں کوئی واقعہ بے مقصد نہیں ہوتا۔ کوئی بھی نہیں۔ دلوں کا ٹوٹنا بھی بے مقصد نہیں ہوتا۔ تکلیف بھی بے مقصد نہیں ہوتی۔ یہ ٹوٹا ہوا دل اور یہ درد ہمارے لئے اسباق اور نشانیاں ہیں۔ یہ انتباہات ہیں جو ہمیں خبردار کر رہے ہیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہمیں بتا رہے ہیں کہ ہمیں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ جیسے جلنے کی تکلیف ہمیں خبردار کرتی ہے کہ ہمیں آگ سے ہاتھ ہٹا لینے چاہئیں، اسی طرح جذباتی تکلیف ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ ہمیں ایک باطنی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں وابستگی ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ تکلیف کسی وابستگی کو بالجبر ختم کرنے کی ایک شکل ہے۔ کسی پیارے کی طرح جو بار بار آپ کو تکلیف دیتا ہے، یہ دنیا ہمیں جتنی زیادہ تکلیف دیتی ہے، ناگزیر طور پر اس کے ساتھ ہماری وابستگی اتنی ہی کمزور پڑتی جاتی ہے، اس کے لئے ہماری محبت میں کمی آتی جاتی ہے۔

• اور تکلیف ہماری وابستگیوں کی طرف ایک اشارہ ہے۔ جو ہمیں رونے پر مجبور کرتا ہے،

جس کی وجہ سے ہمیں سب سے زیادہ تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، اسی کی ذات میں ہماری سب سے بے اصل وابستگی پوشیدہ ہے۔ اور جن چیزوں کے ساتھ ہم نے ایسی وابستگی اختیار کر رکھی ہے جیسی کہ صرف اللہ کے ساتھ ہونی چاہئے، وہ چیزیں اللہ کی طرف جانے والی راہ میں رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔ لیکن درد ایک ایسی چیز ہے جو اس وابستگی کے مصنوعی پن کو عیاں کر دیتا ہے۔ دُکھ درد کی بدولت ہماری زندگی میں ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جسے ہم تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر اس صورتِ حال میں کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم پسند نہیں کرتے، تو اسے تبدیل کرنے کا کلیہ ذاتِ باری تعالیٰ نے ہمیں بتا رکھا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔" (سورۃ الرعد: ۱۱)

سالوں تک مایوسیوں اور دل شکستگی کی ایک ہی ترتیب کو بھگتنے کے بعد، بالآخر مجھے ایک نہایت ہی گہری بات سمجھ آنے لگی۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتی چلی آ رہی تھی کہ دنیا کی محبت سے مراد مادی چیزوں سے وابستگی ہے۔ اور مجھے مادی چیزوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ میری وابستگی لوگوں کے ساتھ تھی۔ میری وابستگی لمحوں کے ساتھ تھی۔ میری وابستگی جذبات کے ساتھ تھی۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ حبّ الدنیا کا میرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ جو بات سمجھنے سے میں قاصر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ لوگ، لمحے، جذبات، سب دنیا ہی کا ایک حصہ ہیں۔ جس امر کا احساس مجھے نہ ہو سکا تھا، وہ یہ تھا کہ زندگی میں جس قدر بھی دُکھ درد کا سامنا مجھے کرنا پڑا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف ایک ہے: دنیا کے لئے محبت۔

جیسے ہی یہ بات میری سمجھ میں آنا شروع ہوئی، میری آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹنے لگا۔ مجھے نظر آنے لگا کہ میرا مسئلہ کیا ہے۔ میں اس زندگی سے وہ بننے کی توقع لگائے بیٹھی تھی جو کہ یہ کبھی بن ہی نہیں سکتی تھی: یعنی کامل، اور اپنی مثالیت پسند فطرت کی بدولت میں دل و جان سے اسے کامل بنانے کی کوششوں میں جتی ہوئی تھی۔ اسے کامل ہونا چاہئے تھا اور جب تک یہ منزل حاصل نہ ہو جاتی، میں رکنے والی نہیں تھی۔ دنیا کو جنت بنانے کی اس سعی کو میں نے اپنے خون، پسینے اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے آس پاس کے

لوگ کامل ہوں۔ میرے رشتے ناطے کامل ہوں۔ میں نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں اور اپنی زندگی سے حد سے زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ توقعات، توقعات، توقعات۔ اور زندگی کو ناخوشی کی آماجگاہ بنانے کا کوئی تیر بہدف نسخہ اگر ہے تو وہ یہی ہے: توقعات۔ لیکن یہیں میری سب سے بڑی غلطی پوشیدہ تھی۔ غلطی یہ نہیں تھی کہ میں نے توقعات لگائی تھیں۔ بہ حیثیت انسان، ہمیں کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں نے اپنی توقعات، اپنی امیدیں غلط جگہ سے جوڑ لی تھیں۔ آخری تجزیئے میں، میری امیدوں اور توقعات کا مرکز ومحور میرے رب کی ذات نہیں تھی۔ بلکہ میں انہیں لوگوں، رشتے ناطوں، وسیلوں سے وابستہ کر رکھا تھا۔ مختصر لفظوں میں، میری امید میرے رب سے نہیں بلکہ اس دنیا سے وابستہ تھی۔

اور لہٰذا مجھے ایک نہایت گہری سچائی کا احساس ہوا۔ ایک آیت میرے ذہن میں ابھرنے لگی۔ میں نے یہ آیت پہلے بھی سن رکھی تھی، لیکن پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت یہ میرا ہی احوال بیان کر رہی تھی:

”جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں ہے اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔“ (سورۂ یونس: ۷)

ہر چیز اس دنیا میں پائی جا سکتی ہے، یہ سوچ پال لینے کی بدولت، اپنے رب کے ساتھ ہونے والی ملاقات سے میری کوئی امید وابستہ نہ رہی تھی۔ میری امید دنیا سے وابستہ تھی۔ لیکن دنیا کے ساتھ امید وابستہ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے پاس دوست ہوں تو ان سے یہ توقع نہ لگائی جائے کہ وہ آپ کے خالی پن کو بھریں گے۔ جب آپ کی شادی ہو تو اپنے شریک حیات سے یہ توقع نہ لگائی جائے کہ وہ آپ کی ہر ضرورت پوری کرے گا۔ جب آپ کسی نصب العین کے لئے کام کر رہے ہوں تو اپنی امیدیں، نتائج کے ساتھ وابستہ نہ کی جائیں۔ جب آپ مشکل میں ہوں تو اپنے آپ پر تکیہ نہ کیا جائے۔ لوگوں پر تکیہ نہ کیا جائے۔ اپنے رب پر تکیہ کیا جائے۔

لوگوں سے مدد ضرور مانگئے مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ لوگ (یا خود آپ بھی) آپ کا تحفظ نہیں

کر سکتے۔ یہ کام صرف اللہ کی ذات ہی کر سکتی ہے۔ لوگ محض اسباب ہیں، انہیں بروئے کار لانے کا کام اللہ کرتا ہے۔ لوگ کسی طرح کی امداد نہیں، اعانت نہیں، نجات نہیں۔ یہ مقام صرف اللہ کو حاصل ہے۔ لوگ تو مکھی کا ایک پر بھی نہیں بنا سکتے (اللہ کے سوا جن جن (معبودانِ باطل) کو تم پکارتے رہے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، چاہے سارے کے سارے ہی جمع ہو جائیں۔ سورہ الحج: ۷۳)۔ اور اس لئے، خواہ ظاہری طور پر آپ کا میل ملاپ لوگوں سے رہنے، لیکن باطنی طور پر اپنے دل کا رخ اللہ کی طرف موڑیئے۔ صرف اسی سے لو لگائیے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت خوبصورت الفاظ میں کہا تھا:

"میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

(سورہ الانعام: ۷۹)

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس منزل تک اپنے سفر کو کس انداز میں بیان کرتے ہیں؟ وہ چاند، سورج اور ستاروں پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کامل نہیں ہیں۔

یہ غروب ہو جاتے ہیں۔

یہ ہمیں مایوس کرتے ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا رخ صرف اللہ کی طرف کرنے کے مقام تک پہنچ گئے۔ ان کی طرح ہمیں بھی اپنی ہر امید، ہر یقین، اور ہر انحصار صرف اور صرف اللہ سے وابستہ کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم ایسا کر گزریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ دل کے سکون اور ثبات کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ تب ہی نشیب و فراز کا وہ سلسلہ ختم ہو گا جس نے اس وقت تک ہماری زندگی کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہماری باطنی کیفیت کا انحصار کسی ایسی چیز پر ہے جو اپنی اصل میں متغیر و بے ثبات ہے تو ہماری باطنی کیفیت بھی ہمیشہ بے چینی، بے ثباتی اور اضطراب کی شکار رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک لمحہ ہم خوش ہوتے ہیں، لیکن جیسے ہی اس چیز میں تبدیلی آتی ہے جس پر کہ ہماری خوشی کا انحصار ہے، ہماری خوشی بھی تبدیل ہو جاتی ہے، اور ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ دو انتہاؤں کے درمیان جھولتے رہتے ہیں اور ہمیں سمجھ بھی

نہیں آتی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

ہمیں اس جذباتی اتھل پتھل سے اس لئے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ جب تک ہم اس چیز سے وابستہ اور اس پر منحصر نہیں ہوں گے جو پائیدار اور مستقل ہے، تب تک ہمیں استقلال اور دیرپا سکون حاصل نہیں ہوگا۔ اگر ہم نے کسی بے ثبات اور عارضی چیز کا دامن تھام رکھا ہے تو ہم ثبات و استقلال کی امید کیسے کر سکتے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ اس صداقت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا تو لوگ صدمے میں آ گئے اور اس خبر کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئے۔ اگرچہ کسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابوبکرؓ کے جیسی محبت نہ تھی، لیکن انہیں بخوبی علم تھا کہ انسان کو اپنا واحد آسرا کس ذات کو بنانا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا:

> ''اگر تم محمد ﷺ کی عبادت کرتے تھے تو جان لو کہ محمد ﷺ انتقال کر چکے ہیں۔ لیکن اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے تو جان لو کہ اللہ کو کبھی موت نہیں آئے گی۔''

اس کیفیت کو حاصل کرنے کے لئے، اپنے اطمینان و سکون کا ذریعہ صرف رب کے ساتھ اپنے تعلق کو بنائیے۔ آپ کی کامیابی، ناکامی یا خود توقیری کا واحد پیمانہ اپنے رب کے ساتھ آپ کا تعلق ہونا چاہئے (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے: سورہ الحجرات: ۱۳)۔ اور اگر آپ ایسا کر لیں تو آپ ناقابل شکست ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ نے ایک ناقابل شکست سہارے کا دامن تھام لیا ہے۔ آپ ناقابل تسخیر ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ کا حامی و ناصر ناقابل تسخیر ہے۔ اور آپ کبھی خالی نہیں ہوں گے کیونکہ آپ کو دینے والی ذات کے خزانے لامحدود ہیں اور ان میں کبھی کوئی کمی نہیں آتی۔

سترہ سال کی عمر میں آنے والے اپنے خواب کو مڑ کر دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کیا وہ ننھی سی لڑکی میں خود تھی۔ میرے ذہن میں یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کیونکہ جو جواب میں نے اسے دیا تھا، وہ ایک سبق تھا، ایک ایسا سبق جسے خود سیکھنے کے لئے مجھے کرب و اذیت کے کئی سالوں سے گزرنا پڑا۔ اس کا سوال تھا: لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کیوں ہونا پڑتا ہے؟ میرا

جواب تھا: ''کیونکہ یہ زندگی کامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ زندگی کامل ہوتی تو ہم اگلی زندگی کو کیا نام دیتے؟''

لوگ چلے جاتے ہیں لیکن کیا واپس بھی آتے ہیں؟

جدا ہونا دشوار ہے۔ کسی کو کھو دینا دشوار تر ہے۔ اس لئے چند ہفتے پہلے میں نے یہ سوال کیا: ''لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کیوں ہونا پڑتا ہے؟'' اس کے جواب نے مجھے اپنی زندگی کی چند عمیق ترین دریافتوں اور کشاکشوں سے روشناس کرایا۔ تاہم، اس کی بدولت میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوئی: جب لوگ چلے جاتے ہیں تو کیا وہ کبھی واپس بھی آتے ہیں؟ کیا جدائی مستقل ہوتی ہے...... یا محض کسی ارفع تر مقصد کی طرف لے جانے والا ایک راستہ ہوتی ہے؟ کیا کھو دینا بجائے خود ایک مقصد ہے یا ہمارے دل کے زخموں کا ایک عارضی اندمال ہے؟

زندگی بڑی انوکھی چیز ہے۔ جو دنیاوی خصائص ہمارے لئے دکھ اور تکلیف کا موجب بنتے ہیں، انہی کی بدولت ہمیں دکھ اور تکلیف سے نجات بھی ملتی ہے۔ یہاں کوئی چیز ہمیشہ نہیں رہتی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے گلدان میں سجا دلکش و دلفریب گلاب کل مرجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری جوانی مجھ سے تغافل برتے گی، مجھے نظر انداز کرے گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو دکھ اور اداسی آج مجھے گھیرے ہوئے ہے، کل تبدیل ہو جائے گی۔ میرا درد ختم ہو جائے گا۔ میری ہنسی ہمیشہ باقی نہیں رہے گی...... لیکن میرے آنسو بھی ہمیشہ بہتے نہیں رہیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ زندگی کامل نہیں۔ اور سچ بھی یہی ہے۔ یہ مکمل طور پر اچھی نہیں ہے، لیکن یہ مکمل طور پر بری بھی نہیں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایک نہایت گہرے مفہوم کی حامل آیہ مبارکہ میں ہمیں آگاہ کرتا ہے:

''پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔'' (سورہ الم نشرح: ۵)

میرا خیال ہے کہ بلوغت کی منازل طے کرنے کے دوران میں اس آیت کا غلط مطلب لیتی رہی۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کا مطلب ہے کہ مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر، میرا خیال تھا کہ زندگی اچھے اور برے وقتوں سے مرکب ہے۔ برے وقت کے بعد اچھا وقت آتا ہے۔ میں اسے یوں سمجھتی تھی جیسے زندگی یا پوری طرح سے اچھی ہوتی ہے یا پوری طرح سے

بری۔ مگر اس آیت کا مفہوم یہ نہیں۔ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی آتی ہے۔ یعنی مشکل اور آسانی دونوں کا ظہور بیک وقت ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کوئی بھی چیز کبھی مکمل طور پر بری (یا مکمل طور پر اچھی) نہیں ہوتی۔ ہر کٹھنائی میں بھی کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے کہ جس پر اللہ کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔مشکل کے ساتھ اللہ ہمیں اسے برداشت کرنے کی قوت اور صبر بھی عطا کرتا ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی کے مشکل وقتوں کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ان میں بہت سی اچھی باتیں بھی پوشیدہ تھیں۔سوال یہ ہے کہ ہم آسانی پر فوکس کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا کٹھنائی پر؟ میرے خیال میں ہم جس مغالطے کے شکار ہوتے ہیں، اس کی جڑیں اس کاذبانہ عقیدے میں پوشیدہ ہیں کہ یہ زندگی کامل ہوسکتی ہے، یعنی کامل طور پر اچھی یا کامل طور پر بری۔ تاہم، یہ اس دنیا کا، دنیاوی زندگی کا خاصہ نہیں ہے۔ یہ خصوصیت اخروی زندگی کو حاصل ہے۔ کاملیت صرف ان چیزوں کو حاصل ہے جن کا تعلق اخروی زندگی سے ہے۔ جنت کامل طور پر اور پوری طرح سے خیر پر مبنی ہے۔اس میں برائی کا شائبہ تک موجود نہیں۔اور جہنم (اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے) کامل طور پر اور پوری طرح سے بری ہے۔ یہاں اچھائی کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔

اس حقیقت کو صحیح معنوں میں سمجھ نہ پانے کی بدولت میں خود بھی اپنی زندگی کے عارضی حالات (خواہ اچھے ہوں یا برے) سے پوری طرح سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ میں ہر صورتِ حال کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی...... جیسے یہی حتمی ہو یا اسے ہمیشہ باقی رہنا ہو۔اس لمحے میں میرے احساسات کی نوعیت میری پوری دنیا کو بہ تمام وکمال تبدیل کر دیتی تھی۔اگر میں خوش ہوتی تو ماضی وحال، بعید وقریب، پوری کائنات اس ایک لمحے میں اچھی نظر آتی تھی۔ جیسے اس دنیا میں کاملیت کا وجود ہوسکتا ہے۔اور برے حالات میں بھی یہی صورتِ حال درپیش ہوتی تھی۔ میری سوچ کی منفیت ہر چیز پر غالب آ جاتی۔ میری پوری دنیا، ماضی و حال، پوری کائنات، اس ایک لمحے میں برے بن جاتے تھے۔ چونکہ یہ لمحہ میری پوری کائنات بن جاتا تھا، اس لئے اس سے باہر کی ہر چیز میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔اس ایک لمحے کے لئے

کسی اور چیز کا وجود بھی باقی نہ رہتا۔ اگر آج آپ نے میرے ساتھ برا سلوک کیا تو اس کی وجہ تھی کہ اب آپ کو میری پرواہ نہیں رہی...... یہ وجہ نہیں کہ یہ ایک لمحہ لامتناہی لمحوں کی زنجیر کی محض ایک کڑی تھا جو اتفاقاً اس رنگ میں رنگ گیا یا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اور میں اور یہ زندگی کامل نہیں ہیں۔ اس ایک لمحے کا تجربہ یا احساس سیاق و سباق کی جگہ لے لیتا کیونکہ یہ ایک پردہ بن کر میری آنکھوں پر چھا جاتا اور دنیا کو میری نگاہوں سے اوجھل کر دیتا۔

میرا خیال ہے کہ اپنی تجربی فطرت کی بدولت، ہم میں سے کچھ پر اس کا اثر خصوصی طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایسی باتیں کہنے پر مائل ہوتے ہیں کہ ''مجھے تمہاری طرف سے کبھی کوئی اچھی بات دیکھنے کو نہیں ملی''، ایک ایسی عادت جس کا حوالہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں ملتا ہے۔ شاید ہم میں سے کچھ ایسی بات کہتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس لمحے میں، تجربی طور پر ہمیں خیر کا مشاہدہ نہیں ہوا ہوتا، کیونکہ ہمارے اس لمحے کے محسوسات ہر چیز کی جگہ لے لیتے ہیں، ہر چیز کا تعین کرتے ہیں اور ہر چیز پر غالب آ جاتے ہیں۔ ماضی و حال ایک تجربی لمحے میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

لیکن جب ہمیں اس امر کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں کوئی چیز کامل نہیں ہوتی، تو اس کے حوالے سے ہمارا تجربہ بدل جاتا ہے۔ یکا یک ہم لمحوں کے ہاتھوں مغلوب ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔ جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی چیز لامحدود نہیں ہے، کوئی چیز کامل نہیں ہے تو اللہ ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ان لمحات سے باہر نکل کر ان کی حقیقت کا مشاہدہ کر سکیں، یہ دیکھ سکیں کہ یہ ہماری کائنات نہیں، ہمارا ماضی و حال نہیں بلکہ لامتناہی لمحات کی زنجیر کی محض ایک کڑی ہیں......اور یہ کہ بالآخر انہیں بھی گزر جانا ہے۔

جب تک میں زندہ ہوں، خواہ میں روؤں، نقصان اٹھاؤں یا چوٹ کھاؤں، کوئی چیز حتمی و قطعی نہیں ہے۔ جب تک آنے والا کل باقی ہے، اگلا لمحہ باقی ہے، تب تک امید باقی ہے، تبدیلی کی گنجائش باقی ہے اور نجات پانے کا رستہ موجود ہے۔ جو کھو گیا، وہ ہمیشہ کھویا ہوا نہیں رہے گا۔

لہٰذا اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ کیا کھوئے ہوئے واپس آتے ہیں، میں سب

سے پیاری مثالوں کا مطالعہ کرتی ہوں۔ کیا یوسف علیہ السلام اپنے والد محترم کے پاس واپس آئے؟ کیا موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ ماجدہ کے پاس واپس آئے؟ کیا ہاجرہ علیہا السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھر سے ملیں؟ کیا ایوب علیہ السلام کو پھر سے صحت، دولت اور اولاد عطا ہوئی؟ ان کہانیوں سے ہمیں ایک طاقتور اور خوبصورت سبق ملتا ہے: اللہ آپ سے جو چیز لے لیتا ہے، وہ کبھی کھوتی نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی چیز باقی رہتی ہے جو اللہ کے پاس ہوتی ہے۔ باقی ہر چیز غائب ہو جاتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

''تمہارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی ہے، اور صبر کرنے والوں کو ہم بھلے اعمال کا بہترین بدلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔'' (سورہ النحل:۹۶)

لہٰذا جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''تم اللہ کے لئے جو چیز بھی چھوڑو گے، اللہ اس کا بدل کسی ایسی چیز سے دے گا جو تمہارے حق میں اس سے بہتر ہوگی۔'' (مسند احمد)

کیا ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا سے ان کا شوہر لے لیا مگر بدلے میں انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت عطا کی؟

کبھی کبھی اللہ کچھ دینے کے لئے ہم سے کچھ لے لیتا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا نہایت اہم ہے کہ اللہ کی عطا ہمیشہ اس شکل میں نہیں ہوتی جس کی ہمارے خیال میں ہمیں طلب ہوتی ہے۔ اللہ کو سب سے بہتر پتہ ہے کہ کون سی چیز سب سے بہتر ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

''ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو، حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو۔'' (سورہ بقرہ:۲۱۶)

لیکن اگر کسی چیز کو کسی نہ کسی شکل میں واپس ہی ملنا ہے تو پھر یہ لی ہی کیوں جاتی ہے؟ سبحان اللہ۔ ''کھونے'' کے عمل کے دوران ہی ہمیں کچھ عطا کیا جاتا ہے۔

اللہ ہمیں نعمتیں عطا کرتا ہے، لیکن اکثر ہم اس کی ذات کے بجائے ان نعمتوں پر تکیہ کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ہمیں دولت عطا کرتا ہے تو ہم اس کے بجائے دولت پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ہمیں احباب عطا کرتا ہے تو ہم اس کے بجائے احباب پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ہمیں مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے تو ہم ان پر انحصار کرنے لگتے ہیں اور ان میں مشغول ہو کر بھٹک جاتے ہیں۔ جب اللہ ہمیں صحت عطا کرتا ہے تو ہم مغالطے کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ ہمیں نعمتیں عطا کرتا ہے لیکن تب ہم ان نعمتوں سے اس انداز میں محبت کرنے لگتے ہیں جس میں کہ صرف اللہ سے محبت کی جانی چاہیے۔ ہم ان نعمتوں کو اپنے دلوں میں بسا لیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہر چیز پر غالب آ جاتی ہیں۔ جلد ہی ہمارا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ بیداری کا ہر لمحہ ان نعمتوں کی فکر میں گزرتا ہے، ہم ان کی اطاعت و عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دل اور ذہن جو اللہ نے اپنے لئے تخلیق کئے تھے، ان پر کسی اور چیز کا، کسی اور فرد کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر خوف ابھرنے لگتا ہے، زیاں کا خوف ہمیں اپاہج کرنے لگتا ہے۔ جس نعمت کو ہمارے ہاتھوں تک محدود رہنا چاہئے تھا، وہ ہمارے دل پر قابض ہو جاتی ہے اور اسے کھونے کا خوف ہمیں مغلوب کر لیتا ہے۔ نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ جو چیز کبھی ایک نعمت تھی، وہ کرب و اذیت کا وسیلہ بن جاتی ہے، ایک ایسا زنداں بن جاتی ہے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہوتا ہے۔ ہم اس سے کیسے رہائی حاصل کر سکتے ہیں؟ کبھی کبھار، اللہ اپنے لامحدود رحم کی بدولت، اس نعمت کو واپس لے کے ہمیں رہائی دلا دیتا ہے۔

اس نعمت کے واپس لے لئے جانے کے نتیجے میں ہم پورے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس مایوسی و محرومی کے عالم میں، ہم التجا کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں۔ نقصان کی بدولت ہمیں اخلاص و انکسار اور اللہ پر توکل کا وہ درجہ حاصل ہوتا ہے جو بصورتِ دیگر ہماری دسترس سے باہر رہتا...... اگر نعمت ہم سے واپس نہ لے لی گئی ہوتی۔ نقصان کی بدولت، ہمارے دلوں کا رخ پوری طرح سے اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔

جب آپ کسی بچے کو کوئی کھلونا یا کوئی نئی ویڈیو گیم دیتے ہیں جس کی اسے ہمیشہ سے

چاہت تھی تو پہلے پہل کیا ہوتا ہے؟ وہ پوری طرح سے اس میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اسے کسی اور چیز کی تمنا ہی نہیں رہتی۔ اسے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ اسے اپنے کام کا ہوش رہتا ہے نہ کھانے پینے کا۔ وہ ایسے سحر میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرنے لگتا ہے۔ تو پھر ایک شفیق باپ یا ماں کی حیثیت سے آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی اس عادت میں غرق ہو کر فوکس اور توازن سے محروم ہو جائے؟ نہیں۔

آپ وہ چیز واپس لے لیتے ہیں۔

پھر جب بچہ اپنی ترجیحات کے حوالے سے دوبارہ یکسوئی حاصل کر لیتا ہے، اس کا ہوش اور توازن بحال ہو جاتا ہے، جب اس کے دل اور ذہن اور زندگی میں ہر چیز اپنی جگہ پر واپس آ جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ آپ وہ تحفہ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ یا شاید اس سے بھی بہتر کوئی اور چیز دے دیتے ہیں۔ لیکن اب یہ تحفہ اس کے دل پر قابض نہیں ہوتا۔ اپنے صحیح مقام پر یعنی اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

لیکن لینے عمل کے دوران سب سے اہم واقعہ رونما ہوا۔ نعمت سے محرومی اور پھر سے اس کا حصول غیر اہم ہے۔ رب کی طرف سے آپ کے تغافل، اس کے علاوہ کسی اور پر انحصار اور فوکس کو لے لینا اور اس کی جگہ صرف اس کی یاد، اس پر انحصار اور اس پر فوکس کو لے آنا اصل نعمت تھی۔ اللہ کچھ دینے کے لئے کچھ روک لیتا ہے۔

اور لہٰذا بعض اوقات، ''کوئی بہتر متبادل'' ہی سب سے بڑی نعمت ہوتا ہے یعنی اللہ کا قرب۔ اللہ نے مالک ابن دینار کو بچانے کے لئے ان سے ان کی بیٹی لے لی۔ اللہ نے ان کی بیٹی لے لی لیکن اس کی جگہ جہنم سے نجات عطا کی اور اللہ سے دوری اور گناہ سے عبارت تکالیف بھری زندگی سے تحفظ دیا۔ اپنی بیٹی سے محروم ہو کر مالک ابن دینار کو اللہ کے قرب میں گزرنے والی زندگی کی نعمت عطا ہوئی۔ اور جو لے لیا گیا (یعنی ان کی بیٹی) اللہ کی جنت میں وہ بھی ہمیشہ مالک ابن دینار کے پاس رہے گا۔

ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مدارج السالکین'' میں اس مظہر کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مومن کے حق میں اللہ کا حکم ہمیشہ انعام ہوتا ہے، بھلے یہ کچھ (کوئی مطلوبہ چیز) روک لئے جانے کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو، اور یہ ایک رحمت ہوتا ہے، بے شک بظاہر یہ آزمائش اور مصیبت ہی کیوں معلوم نہ ہو، بظاہر مرض معلوم ہونے کے باوجود فی الحقیقت یہ شفا ہوتا ہے۔''

لہٰذا اس سوال یعنی ''جب کوئی چیز کھو جاتی ہے تو کیا واپس بھی آتی ہے؟'' کا جواب ''ہاں'' میں ہے۔ یہ واپس آتی ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی کسی مختلف اور بہتر شکل میں۔ لیکن سب سے بڑی نعمت لینے اور دینے کے عمل کے پیچھے پنہاں ہے۔ اللہ ہمیں بتاتا ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے، وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔''

(سورۂ یونس: ۵۸)

اندر کے خلا کو بھرنے اور گھر لوٹ آنے کے بارے میں

ہم اپنے گھر میں ہوتے ہیں۔

اور پھر ہم وہاں نہیں رہتے۔ اپنی اصل سے جدا ہو کے، ہم زمان و مکان کی فصیلیں پھلانگتے ہوئے ایک اور دنیا میں آ گئے۔ ایک کمتر دنیا میں۔ لیکن اس جدائی میں کوئی تکلیف دہ بات وقوع پذیر ہوئی۔ ہم مادی اعتبار سے اللہ کے نزدیک نہیں رہے۔ اب ہم اپنی مادی آنکھوں سے اسے دیکھ نہیں سکتے تھے نہ اپنی مادی آواز کے ذریعے اس سے گفتگو کر سکتے تھے۔ اپنے والد حضرت آدم علیہ السلام کے برعکس، ہم وہی سکون و اطمینان محسوس کرنے کے قابل نہ رہے۔

لہٰذا ہم نیچے آ گئے۔ ہم اپنے رب سے جدا ہو گئے۔ اور اس جدائی کے کرب میں ہمارا خون بہنے لگا۔ پہلی بار ہمارا خون بہا۔ اور اپنے خالق سے یہ جدائی ایک زخم چھوڑ گئی۔ ایک گہرا زخم جسے لے کر ہم سب پیدا ہوئے۔ اور جوں جوں ہم بڑے ہوئے، توں توں اس زخم کی تکلیف بھی بڑھتی گئی، اس کی گہرائی میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اس کے مرہم سے دور ہوتے گئے، جو پہلے ہی ہماری فطرت میں رکھ دیا گیا تھا یعنی اپنے دل، روح اور ذہن میں اپنے رب کے نزدیک ہونا۔

پیغام کو سمجھ نہیں پاتا تو فن پارہ اپنا حقیقی مقصد پورا کرنے میں ناکام رہا۔

پُر جلال سورج، پہلی برفباری، روشن ہلال اور دم بخود کر دینے والے سمندروں کا مقصد محض اس سنسان سیارے کو آرائش و زیبائش عطا کرنا نہیں ہے۔ اس کا مقصد اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ مقصد وہ ہے جو اللہ نے ہمیں قرآن میں بتایا ہے:

''آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔ تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔''

(سورہ آل عمران: ۱۹۱۔۱۹۰)

یہ سارا حسن ایک نشانی کے طور پر تخلیق کیا گیا تھا...... لیکن ایک ایسی نشانی جسے صرف چند چنیدہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ لوگ جو غور و فکر کرتے ہیں، سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں، اپنی عقل استعمال کرتے ہیں، اور ہر انسانی حالت (کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے) اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔

لہٰذا، غروب آفتاب کے منظر کے بھی پار دیکھنا ضروری ہے۔ وہاں بھی، ہم محو و بے خبر نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اس بے پناہ حسن و رنگینی کے بھی پار، اس کے پیچھے چھپی خوبصورتی کو دیکھنا چاہئے، کیونکہ اس کے پیچھے چھپا حسن ہی حقیقی حسن، ہر خوبصورتی کا منبع ہے۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں، وہ محض اس کا عکس ہے۔

ہمیں ستاروں، درختوں، برف پوش پہاڑوں کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ ان میں پنہاں پیغام کو سمجھ سکیں۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہماری مثال اس شخص کی سی ہوگی جسے ایک بڑی خوبصورتی سے سجائی گئی کسی بوتل میں بند ایک پیغام ملتا ہے لیکن وہ بوتل میں ہی اتنا محو ہو جاتا ہے کہ پیغام کو کھول کر پڑھنا بھول جاتا ہے۔

لیکن ستاروں کی چمک میں چھپا یہ پیغام کیا ہے؟ نشانی ہے...... مگر کس چیز کی نشانی؟ یہ

نشانیاں اس رب کی طرف، اس کی عظمت کی طرف، اس کی شان و شوکت کی طرف، اس کے حسن کی طرف اشارے ہیں۔ اس کی قوت اور اس کی قدرت کی طرف اشارے ہیں۔ مطالعہ کیجیے، غور وفکر کیجیے، تخلیق کے حسن اور شوکت کو اپنے دل میں اتاریئے، مگر یہاں پر رکیے نہیں۔ حسن میں گم ہو کر نہ رہ جایئے۔ اس کے پار دیکھیے اور سوچیے کہ اگر تخلیق اتنی پُر شوکت، اتنی عظیم، اتنی حسین ہے تو خالق کتنا پُر شوکت اور عظیم اور خوبصورت ہوگا۔

اور آخر میں، تجربی طور پر، یہ ادراک کیجیے کہ:

''اے ہمارے پرودگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔''

(سورہ آل عمران:۱۹۱)

ہر چیز کا ایک مقصد ہے۔ آسمانوں اور زمینوں، آپ کے اندر یا آپ کی ذات سے باہر، کوئی چیز بے مقصد تخلیق نہیں کی گئی۔ آپ کی زندگی کا کوئی واقعہ، کوئی دُکھ، کوئی خوشی، کوئی تکلیف، کوئی لذت...... کوئی نقصان، بغیر مقصد کے تخلیق نہیں کیا گیا۔ لہٰذا جیسے ہمیں سورج اور چاند اور آسمان کی ''بوتل میں چھپا پیغام'' پڑھنا چاہیے، ویسے ہی ہمیں اپنی زندگی کے تجربات میں پوشیدہ پیغام کا بھی بغور جائزہ لینا چاہیے۔

ہم ہمیشہ نشانیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ اللہ سے التجا کرتے رہتے ہیں کہ ہم سے ''کلام'' کرے۔ مگر یہ نشانیاں ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ یہ ہر چیز میں موجود ہیں۔ اللہ ہمیشہ ''محوِ کلام'' رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم سن رہے ہیں۔

فرمانِ الٰہی ہے:

اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے بھی کہی تھی، ان کے اور ان کے دل یکساں ہو گئے۔ ہم نے تو یقین والوں کے لئے نشانیاں بیان کر دیں۔

(سورۂ بقرہ:۱۱۸)

اگر ہم خود کے ساتھ پیش آنے والے ہر واقعے، اپنے کئے...... یا نہ کئے...... ہر کام کے

پار نگاہ ڈال کر اللہ کو دیکھ سکیں تو ہمیں مقصد کا علم ہو جائے گا۔ جب آپ کے دل پسند کوئی بات ظہور پذیر ہو تو اس کے مقصد سے غافل نہ ہو جایئے۔ یاد رکھئے کہ کوئی چیز بلا سبب نہیں ہوتی۔ سبب کو تلاش کیجئے۔ اللہ نے جو کچھ آپ کو دیا، اس میں چھپے مقصد کو تلاش کیجئے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے جوہر کا کون سا پہلو آپ پر آشکار کر رہا ہے؟ وہ آپ سے کیا چاہتا ہے؟

اسی طرح جب کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جو آپ کو ناگوار گزرے، یا آپ کو تکلیف دے، تو تکلیف سے جنم لینے والے وہم میں گم ہو کر نہ رہ جایئے۔ اس کے پار دیکھئے۔ بوتل میں بند پیغام کو ڈھونڈیئے۔ مقصد کو ڈھونڈیئے۔ اور اس کے ذریعے ذاتِ خداوندی کی ایک اور جھلک دیکھ لیجئے۔

اگر دین کے حوالے سے کوئی کوتاہی یا گناہ بھی سرزد ہو گیا ہے تو شیطان کے دھوکے میں نہ آیئے۔ اس کوتاہی کے ذریعے اللہ کے رحم و کرم کا زیادہ تجربی اور زیادہ گہرے انداز میں مشاہدہ کیجئے۔ اور پھر اس رحم کے لئے دعا کیجئے تاکہ اس کی بدولت آپ اپنے گناہوں اور ان زیادتیوں سے محفوظ رہ سکیں جو آپ خود اپنے ساتھ کرتے ہیں۔

اگر یہ کوئی لاینحل مسئلہ ہے تو مایوس نہ ہویئے۔ اس ذات کا مشاہدہ کیجئے جو اپنے بندوں کے لئے عقدے کھول دیتی ہے۔ اور اگر یہ کوئی طوفان ہے تو خود کو ڈوبنے نہ دیجئے۔ اس کی بدولت مشاہدہ کیجئے کہ کیسے صرف اللہ کی ذات ہی اپنے بندوں کو طوفانوں سے بچا سکتی ہے، جب کوئی اور مددگار نہیں ہوتا۔

اور یاد رکھئے کہ جب ساری خلقت تباہ ہو جائے گی اور اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی باقی نہیں رہے گا تو اللہ سوال کرے گا: ''آج کس کی بادشاہی ہے؟''

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

''جس دن سب لوگ ظاہر ہو جائیں گے، ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گی، آج کس کی بادشاہی ہے، فقط اللہ واحد و قہار کی۔''

(سورہ المومن:۱۶)

آج کس کی بادشاہی ہے؟ اس زندگی میں اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا بھی

مشاہدہ کرنے کا کوشش کیجئے۔ آج کس کی حکومت ہے؟ کس کے پاس آپ کو بچا لینے کی قوت ہے؟ کون آپ کو شفا بخش سکتا ہے؟ کون آپ کے ٹوٹے دل کو جوڑ سکتا ہے؟ کون آپ کی ضرورتیں پوری کرسکتا ہے؟ آپ کس کی رحمت میں پناہ ڈھونڈ سکتے ہیں؟ ایسا اور کون ہے؟ آج کس کی حکومت ہے؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟

فقط اللہ واحد وقہار کی۔ جو واحد ہے، جو قوی ہے۔ کسی اور کی پناہ ڈھونڈنے کا مطلب ہوگا کہ قوی کو چھوڑ کر کمزور کی پناہ ڈھونڈی جائے۔ واحد کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف دیکھنے کا مطلب بکھر جانا ہے، کبھی تسکین نہ پانا ہے۔ اگر ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف رجوع کریں تو ہم اتحاد کیسے پا سکتے ہیں؟ دل یا روح یا ذہن کا اتمام کیسے پا سکتے ہیں؟

لہٰذا، واپس اسی طرف جاتے ہوئے جہاں سے ہم نے آغاز کیا تھا، کون ایسا ہے جس کے دامن میں ہم پناہ لے سکتے ہیں؟ ہم اور کس کی طلب کر سکتے ہیں؟ آخر ہم سب کی تمنا ایک ہی تو ہے یعنی ثابت وسالم ہونا، خوش ہونا، ایک بار پھر سے کہنا:

ہم اپنے گھر میں آ گئے۔

برتن خالی کرنا

کسی برتن کو بھرنے سے پہلے اسے خالی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دل ایک برتن ہے۔ اور کسی بھی برتن کی طرح، دل کو بھی خالی کرنا ضروری ہے، اس سے پہلے کہ اسے بھرا جا سکے۔ اگر دل دوسری چیزوں سے خالی نہ ہوگا تو اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بھرنے کی کوشش نہیں کی جا سکتی۔

دل خالی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ محبت نہ کی جائے۔ اس کے برعکس، جو سچی محبت خدا کا مقصود ہے، اسی وقت خالص ترین ہوتی ہے جب اس کی بنیاد جھوٹی وابستگیوں پر نہ رکھی جائے۔ پہلے دل کو خالی کرنے کا عمل، کلمہ شہادت کے پہلے نصف حصے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ ایمان کے اعلان کا آغاز ایک نہایت اہم نفی سے، خالی کرنے کے ایک نہایت اہم عمل سے ہوتا ہے۔ حقیقی توحید تک پہنچنے سے پہلے، اللہ پر ایمان کا اظہار کرنے سے پہلے، ہمیں یہ اعلان کرنا پڑتا ہے: ''کوئی معبود نہیں۔'' معبود وہ ہوتا ہے جس کی پرستش کی جائے۔ لیکن یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ معبود محض کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی ہم عبادت کرتے ہیں۔ معبود وہ ہے جسے

ہم اپنی زندگی کا مرکز ومحور بناتے ہیں، جس کی ہم اطاعت کرتے ہیں، جو ہمارے لئے ہر دوسری چیز سے بڑھ کر اہمیت رکھتا ہے، ہر دوسری چیز سے بالا ہوتا ہے۔

معبود وہ ہے جس کیلئے ہم زندہ رہتے ہیں......اور جس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

اس لئے ہر شخص کا ایک معبود ہوتا ہے خواہ وہ دہریا ہو، لاادری ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، یا یہودی ہو۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کی پرستش کرتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا معبود کوئی ایسی ہستی، ایسی چیز ہوتی ہے جس کا تعلق اسی دنیا سے ہو۔ کچھ لوگ دولت کی پوجا کرتے ہیں، کچھ مقام مرتبے کی، کچھ نام ونمود کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ عقل و دانش کی۔ کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو اپنا معبود مانتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں جو خود اپنی، اپنی خواہشات، اپنی من موجیوں کی عبادت کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

> ''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا؟ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود سمجھ بوجھ کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے اب ایسے شخص کو اللہ کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟'' (سورہ الجاثیہ:۲۳)

یہ معبود وہ چیزیں ہیں جن سے ہم وابستگی اختیار کر لیتے ہیں۔ تاہم، جس سے وابستگی اختیار ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ اس سے محبت بھی ہو۔ یہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے، لفظ ''ضرورت'' کے عمیق ترین معنوں میں۔ یہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو کھو جائے تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے علاوہ کوئی بھی ایسی چیز، یا ایسا فرد، ہے جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے تو ہم ایک جھوٹی وابستگی میں گرفتار ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے کیوں کہا گیا؟ تاکہ انہیں آزاد کرایا جا سکے۔ تاکہ انہیں ایک جھوٹی وابستگی سے رہائی عطا کی جا سکے۔ ایک دفعہ جب وہ آزاد ہو گئے تو ان کی وابستگی کا مرکز نہیں بلکہ ان کی محبت کا مرکز انہیں لوٹا دیا گیا۔

اگر کوئی ایسی چیز یا ایسا فرد ہے جس سے محروم ہونے کی صورت میں ہم یکسر شکست و

ریجنت کے شکار ہو جائیں تو ہم ایک جھوٹی وابستگی میں گرفتار ہیں۔ جھوٹی وابستگیاں ایسی چیزیں ہیں جن سے محرومی کا خوف ہمیں تقریباً مریضانہ حد تک لاحق ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اپنی گرفت سے پھسلتی ہوئی محسوس بھی ہو تو ہم پاگلوں کی طرح اس کے تعاقب میں دوڑ پڑتے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے اس لئے بھاگتے ہیں کیونکہ جس چیز سے وابستگی ہوتی ہے اس سے محروم ہونا ہماری دنیا تہ و بالا کر دیتا ہے، اور اس تباہی کی شدت ہماری وابستگی کی شدت سے راست تناسب رکھتی ہے (یعنی جتنی زیادہ وابستگی ہوگی، اتنی ہی زیادہ تباہی کا احساس ہوگا)۔ یہ وابستگیاں روپے پیسے سے ہو سکتی ہیں، مال اسباب سے ہو سکتی ہیں، دیگر افراد سے ہو سکتی ہیں، کسی نظریئے یا تصور سے ہو سکتی ہیں، کسی جسمانی لذت سے ہو سکتی ہیں، کسی نشے سے ہو سکتی ہیں، مقام و مرتبے کی کسی علامت سے ہو سکتی ہیں، ہمارے کریئرز سے ہو سکتی ہیں، ہمارے شخصی تاثر سے ہو سکتی ہیں، اس امر سے ہو سکتی ہیں کہ دوسرے ہمیں کس انداز میں دیکھتے ہیں، اپنی شکل وصورت اور حسن سے ہو سکتی ہیں، ہمارے لباس اور وضع قطع سے ہو سکتی ہیں، ہماری تعلیمی ڈگریوں سے ہو سکتی ہیں، ہمارے خطابات و اعزازات سے ہو سکتی ہیں، اقتدار و اختیار کے احساس سے ہو سکتی ہیں، ہماری اپنی ذہانت اور عقل سے ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب تک ہم ان جھوٹی وابستگیوں سے نجات حاصل نہیں کرتے، دل کا برتن خالی نہیں کر سکتے۔ اور اگر ہم برتن خالی نہیں کرتے تو اسے حقیقی معنوں میں اللہ کے ساتھ نہیں بھر سکتے۔

اپنے دل کو تمام جھوٹی وابستگیوں سے خالی کرنے کی جدوجہد، دل کے برتن کو خالی کرنے کی جدوجہد، اس دنیاوی زندگی کی سب سے بڑی جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد توحید کا جوہر ہے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ اگر گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا جائے تو اسلام کے پانچوں ارکان بنیادی طور پر وابستگی ختم کرنے کے بارے میں ہی ہیں اور اسی کے اسباب پیدا کرتے ہیں:

☆ کلمۂ شہادت:

کلمۂ شہادت وابستگی کے اسی اختتام کا زبانی اظہار ہے جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے: یہ کہ ہماری عبادت، حتمی عقیدت، محبت، خوف اور امید کا واحد مرکز صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔ خالق کی ذات کے علاوہ باقی سب چیزوں سے وابستگی ختم کر دینا توحید کا سب سے سچا

اظہار ہے۔

☆نماز:

دن میں پانچ مرتبہ ہمیں دنیاوی مصروفیات کو ترک کر کے اپنے خالق اور اپنے حقیقی مقصد پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے وقت نکالنا ہوتا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ ہم خود کو اپنی دنیاوی زندگی کے تمام کاموں سے جدا کر کے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ دن میں یا ہفتے میں صرف ایک مرتبہ نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا یا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پانچوں نمازیں روزانہ ایک ہی وقت میں پڑھ لی جاتیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ نمازیں پورے دن پر محیط ہیں۔ اگر کوئی مقررہ وقت پر ہر نماز ادا کرتے رہے تو وابستگی اختیار کرنے کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے ہی ہم کسی دنیاوی سرگرمی میں منہمک ہونے لگتے ہیں (مثلاً جو کام ہم کر رہے ہیں، ٹی وی پر جو پروگرام ہم دیکھ رہے ہیں، جس ٹسٹ کے لئے ہم پڑھائی کر رہے ہیں، جس شخص کی یاد میں ہم مگن ہیں)، ہمیں مجبور کیا جاتا ہے کہ خود کو اس سے الگ کریں اور اپنی توجہ، اپنی وابستگی کے حقیقی مرکز و محور پر مرکوز کریں۔

☆روزہ:

روزے کا سارا مقصد ہی وابستگیوں کو ختم کرنا ہے۔ یہ خور و نوش، جسمانی قربت، فضول گفتگو سے وابستگی کا خاتمہ ہے۔ اپنے مادی وجود کو پابند کر کے، ہم اپنے روحانی وجود کا تزکیہ کرتے ہیں، تطہیر کرتے ہیں اور اس کی بالیدگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ روزے کی بدولت ہم اپنی جسمانی ضروریات، خواہشوں اور لذائذ سے کنارہ کشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

☆زکوٰۃ:

زکوٰۃ کا مقصد مال و دولت سے اپنی وابستگی ختم کرنا اور اسے اللہ کی راہ میں خیرات کرنا ہے۔ خیرات کرنے کی بدولت ہم سے مال و دولت علیحدگی اختیار کر لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

☆حج:

حج وابستگی ختم کرنے کا سب سے جامع اور گہرا طریقہ ہے۔ حج کرنے والا زندگی کی ہر

چیز کو چھوڑ کر آتا ہے۔ وہ اپنے گھر اور گھر والوں، اپنی آمدنی، اپنے گرم بستر، اپنے آرام دہ جوتوں اور قیمتی کپڑوں سے کنارہ کشی کر لیتا ہے، اور اس کی جگہ زمین پر یا ایک پُر ہجوم خیمے میں سونا اور کپڑے کے دو سادہ سے ٹکڑے پہن لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ حج کے دوران کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔ احرام کا کوئی ''برینڈ'' نہیں ہوتا، کسی خیمے کو ''فائیو سٹار'' نہیں ملتے۔ (حج کے جو پیکیجز فائیو سٹار ہوٹلوں کا وعدہ کرتے ہیں، ان کا تعلق حج سے پہلے یا بعد کے وقت سے ہوتا ہے۔ حج کے دوران آپ منیٰ میں ایک خیمے میں، اور مزدلفہ میں زمین پر کھلے آسمان تلے سوتے ہیں۔)

یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ کی لامتناہی دانش و حکمت اور رحمت کیسے کام کرتی ہے؛ وہ ہم سے صرف دنیا سے کنارہ کشی کر لینے کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ہمیں اس کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ ارکانِ اسلام سے آگے، ہمارا لباس بھی کنارہ کشی کو فروغ دیتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں ہدایت کرتے ہیں کہ اپنی ظاہری وضع قطع میں بھی خود کو منفرد بناؤ، ہجوم سے الگ نظر آؤ۔ حجاب، ٹوپی یا داڑھی سے آراستہ ہونے کے بعد آپ، چاہنے کے باوجود، ہجوم کا حصہ نہیں بن سکتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

> ''اسلام غربت سے شروع ہوا، اور غربت کو واپس لوٹ جائے گا، لہٰذا غریبوں کو خوشخبری سنا دو۔'' (صحیح مسلم)

(غربت ''انوکھے پن''، ''انفرادیت'' اور ''اجنبیت'' کے معنی بھی رکھتی ہے، محض مفلسی کے نہیں۔ مترجم)

اس دنیا سے ''اجنبی'' ہو کر، ہم اس کا حصہ بنے بغیر اس میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ اور اس بیگانگی کے ذریعے ہم دل کے برتن کو خالی کر کے اس چیز کے لئے تیار کر سکتے ہیں جو اسے تقویت دیتی ہے اور زندگی سے آشنا کرتی ہے۔ اپنے دل کو خالی کر کے ہم اسے اس کی حقیقی غذا یعنی اللہ کے لئے تیار کرتے ہیں۔

تحفے کی محبت کے لئے

ہم سب کو تحفے پسند ہوتے ہیں۔ ہمیں وہ رحمتیں بڑی عزیز ہوتی ہیں جو ہماری زندگیوں

کو خوبصورت بناتی ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں، اپنے شریک حیات، اپنے والدین، اپنے دوستوں سے پیار ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی جوانی اور اپنی صحت سے محبت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنا گھر، اپنی گاڑیاں، اپنی دولت، اور اپنا حسن بہت عزیز ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی تحفہ، تحفے سے بڑھ کر کوئی حیثیت حاصل کر جائے تو کیا ہوتا ہے؟ جب کوئی خواہش، ضرورت، کوئی احسان، محتاجی بن جائے تو کیا ہوتا ہے؟ جب تحفہ محض تحفہ نہ رہے تو کیا ہوتا ہے؟

تحفہ کیا ہوتا ہے؟ تحفہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو ہماری طرف سے نہیں ہوتی۔ تحفہ دیا جاتا ہے، اور لیا جا سکتا ہے۔ ہم تحفے کے اصلی مالک نہیں ہوتے۔ تحفہ ہمارے وجود کی بقا کے لئے ضروری بھی نہیں ہوتا۔ یہ آتا جاتا رہتا ہے۔ ہمیں تحفوں کی طلب ہوتی ہے اور ہمیں انہیں بہت پسند بھی کرتے ہیں...... لیکن یہ ہماری زندگی کے لئے ضروری نہیں۔ ہم ان پر تکیہ نہیں کرتے۔ ہم انہیں وصول کرنے کے لئے زندہ نہیں رہتے اور اگر تحفے نہ ملیں تو ہم مرتے نہیں۔ ان کی حیثیت ہوا یا کھانے پانی جیسی نہیں، مگر ہمیں یہ بہت پسند ہوتے ہیں۔ کون ہے جسے تحفہ پسند نہیں ہوتا؟ کون ہے جسے بہت سے تحائف پانے کی تمنا نہیں ہوتی؟ اور ہم خداوند کریم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے تحائف سے کبھی محروم نہ کرے۔ اس کے باوجود، ہم تحائف پر انحصار نہیں کرتے، اور ان کے بغیر ہماری زندگی ختم نہیں ہوتی۔

یاد رکھئے کہ کسی چیز کو رکھنے کے لئے دو ہی جگہیں ہوتی ہیں: یا تو اس کو ہاتھ میں رکھا جائے یا دل میں رکھا جائے۔ ہم تحفے کو کہاں رکھتے ہیں؟ تحفے کو دل میں نہیں رکھا جاتا۔ اسے ہاتھ میں رکھا جاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی تحفہ لے لیا جاتا ہے تو ہاتھ کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن دل کو نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی بھی اس دنیا میں خاطر خواہ زندگی گزار چکا ہے، اسے معلوم ہے کہ ہاتھ کی تکلیف، دل کی تکلیف جیسی نہیں ہوتی۔ دل کی تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب کوئی ایسی چیز لے لی جائے جس سے ہماری وابستگی ہو، جس کا ہمیں نشہ ہو یا جس پر ہم انحصار کرتے ہوں۔ اس تکلیف جیسی اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ کوئی عام تکلیف نہیں ہوتی، اور اس تکلیف کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے کوئی ایسی چیز لے لی گئی ہے جس سے ہماری وابستگی تھی، ایک ایسا تحفہ جسے غلط جگہ پر رکھ دیا گیا تھا۔

ہاتھ کی تکلیف بھی تکلیف ہی ہوتی ہے لیکن یہ مختلف ہوتی ہے۔ بہت زیادہ مختلف۔ ہاتھ کی تکلیف کا تعلق محرومی سے ہوتا ہے لیکن کسی ایسی چیز سے محرومی نہیں جس پر ہم تکیہ کرتے ہوں۔ جب ہاتھ سے کوئی تحفہ لے لیا جاتا ہے...... یا سرے سے دیا ہی نہیں جاتا...... تو ہمیں محرومی کا عام انسانی درد محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں دُکھ ہوتا ہے۔ ہمارے آنسو بہتے ہیں۔ لیکن یہ تکلیف ہاتھ تک محدود رہتی ہے۔ ہمارا دل ثابت و سالم رہتا ہے، دھڑکتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل اللہ کے لئے ہوتا ہے۔

صرف اللہ کے لئے:

اگر ہم اپنی زندگی میں موجود ایسی چیزوں کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے ہم سب سے زیادہ تکلیف یا خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہم ایسے تحائف کی نشاندہی کر سکتے ہیں جنہیں غلط جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر شادی نہ کر پانا، اپنے محبوب کا ساتھ حاصل نہ کر پانا، اولاد سے محروم رہنا، بے روزگار رہنا، ایک مخصوص شکل وصورت کا حامل ہونا، تعلیمی ڈگری حاصل نہ کر پانا، یا کوئی خاص مرتبہ حاصل نہ کر پانا ہماری زندگی پر غالب آ گیا ہے تو ہمیں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تحفے کے رکھے جانے کا مقام تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تحفے کو اپنے دل سے نکال کر، اپنے ہاتھ میں لانے کی ضرورت ہے جو کہ اس کا صحیح مقام ہے۔

ہم ان چیزوں سے پیار کر سکتے ہیں۔ پیار انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اور اپنی پسند کے تحائف کی خواہش رکھنا بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ لیکن مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم تحفے کو اپنے دل میں جگہ دے دیتے ہیں، اور خدا کو ہاتھ میں رکھ لیتے ہیں۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن اگر ہمیں تحفے سے محروم ہونا پڑے تو ہم ڈھیر ہو جاتے ہیں، اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

اس کے نتیجے میں خدا کو بالائے طاق رکھنا بہت آسان لیکن تحفے کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہم تو تحفے کی خاطر خدا کو بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے نماز میں تاخیر کرنا یا نماز چھوڑ دینا آسان ہو جاتا ہے لیکن اپنی کاروباری میٹنگ کو چھوڑنا، اپنی فلم کو چھوڑنا، اپنی سیر و تفریح کو ترک کرنا، اپنی خریداری، کلاس، پارٹی یا کرکٹ میچ کو چھوڑنا مشکل۔ سودی قرضے لینا یا

شراب بیچنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اپنے منافعے یا شاندار کریئر کو ترک کرنا مشکل۔ اپنی نئی گاڑی اور ضرورت سے بڑے گھر کو چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی سے حرام تعلق جوڑنا یا ''ڈیٹ مارنا'' آسان ہو جاتا ہے، لیکن اپنے ''محبوب'' کو چھوڑنا مشکل۔ گھومنا پھرنا یا حجاب نہ پہننا آسان ہو جاتا ہے لیکن اپنے حسن، اپنی شکل وصورت، اپنی شادی کے رشتوں یا دوسروں کی نگاہوں میں اپنی شبیہ کو چھوڑنا مشکل۔ اس حیا کو چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے جسے اللہ نے حسن قرار دیا ہے، لیکن اپنے نت نئے کپڑوں کو ترک کرنا مشکل کیونکہ معاشرے نے ہمیں بتایا ہے کہ یہی چیزیں حقیقی حسن ہیں۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ہم نے تحفے کو دل میں جگہ دے رکھی ہوتی ہے اور خدا کو ہاتھ میں تھام رکھا ہوتا ہے۔ اور جو چیز ہاتھ میں ہوتی ہے، اسے بالائے طاق رکھنا آسان ہوتا ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اور اسے پاس رکھنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر ہمیں خود سے یہ سوال پوچھنا چاہئے کہ حقیقی معنوں میں ہم کس کی پرستش کرتے ہیں: تحفے کی یا تحفہ دینے والے اللہ کی؟ حسن کی یا حسن کے سرچشمے اور حسن کے مفہوم یعنی اللہ کی؟ رزق کی یا رزاق کی؟

مخلوق کی یا خالق کی؟

ہمارے انتخاب کا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی گردن میں وابستگیوں کا طوق ڈال لیتے ہیں، اور پھر پوچھتے ہیں کہ ہمارا دم کیوں گھٹ رہا ہے۔ ہم اپنی حقیقی ہوا (یعنی اللہ) کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور پھر حیران ہوتے ہیں کہ ہماری سانس کیوں رک رہی ہے۔ ہم اپنی واحد غذا کو ترک کر دیتے ہیں، اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔ الغرض، ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے میں خنجر اتارتے ہیں اور پھر شور مچاتے ہیں کہ ہمیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہت تکلیف۔ لیکن ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے، خود اپنے ساتھ ہی کیا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

''اور تمہیں جو تکلیف پہنچی، وہ اس کے سبب ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا، اور وہ تو بہت کچھ معاف فرما دیتا ہے۔'' (سورہ الشوریٰ: ۳۰)

ہاں، ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے، خود اپنے ساتھ ہی کیا ہے، لیکن یہ دیکھئے کہ اس آیہ مبارکہ کا اختتام کن الفاظ پر ہوتا ہے: ''وہ بہت کچھ معاف فرما دیتا ہے۔'' یہاں جو لفظ استعمال کیا گیا، وہ ''یعفو'' ہے، جو اللہ کے صفت مبارک ''العفو'' سے نکلا ہے۔

اس کا مطلب محض معاف کرنا یا بخش دینا نہیں بلکہ مکمل طور پر مٹا دینا، ختم کر دینا ہے۔ اس لئے، خواہ ہم کتنی مرتبہ بھی اپنے سینے میں خنجر گھونپیں، اللہ ہمارا زخم بھر سکتا ہے...... اور اس انداز میں کہ جیسے کبھی زخم لگا ہی نہیں تھا۔ ''جبار'' اسے مندمل کر سکتا ہے۔

اگر آپ اس کی طرف رجوع کریں۔

لیکن اس کی حماقت کا کیا عالم ہوگا جو سانس لینے کی ہوا کے بدلے گلے کا ہار لے لے؟ یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے: ''یہ ہار مجھے دے دو، اس کے بعد میری ہوا لے لینا۔ میرا دم گھونٹ دینا، بس اس بات کا خیال رکھنا کہ مرتے وقت یہ ہار میرے گلے میں ہو۔'' اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یہ ہار ہی ہمارا دم گھونٹتا ہے۔ جن چیزوں سے ہماری وابستگی ہوتی ہے، جن چیزوں سے ہم خدا سے بھی زیادہ محبت رکھتے ہیں، وہی ہماری ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔

ہمارے مسئلے کا آغاز اس لئے ہوا کیونکہ ہم نے تحفے کو محض تحفہ سمجھنے کے بجائے، ہوا سمجھ لیا۔ آنکھیں بند کر کے ہم تحفے پر تکیہ کرنے لگے، اور حقیقی ہوا یعنی اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔ نتیجتاً جب تحفہ واپس لیا گیا یا پھر ہمیں دیا ہی نہیں گیا تو ہمیں لگا کہ اب زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ وہ جھوٹ تھا جو ہم نے خود سے بولا تھا، اتنی بار کہ ہم اس پر یقین کرنے لگے۔ یہ سچ نہیں ہے۔ صرف ایک نقصان ایسا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک وجہ ہے کہ ہم زندہ رہنے کے قابل نہ رہیں۔ اور وہ یہ کہ اگر خدا ہماری زندگیوں سے نکل جائے۔ ستم ظریفانہ امر یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کی زندگیاں خدا سے محروم ہو چکی ہیں، لیکن پھر بھی ہم خود کو زندہ سمجھتے ہیں۔ اس کے تحائف پر ہمارے جھوٹے انحصار نے ہمیں گہرے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

صرف اللہ ہی ہماری بقا ہے۔ اس کے تحفے نہیں۔ اللہ ہمارا آسرا اور ہماری واحد حقیقی ضرورت ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟ یہ لوگ آپ کو اللہ کے

سواوروں سے ادارہے ہیں، اور جسے اللہ گمراہ کردے اس کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔" (سورہ الزمر:۳۶)

ہم سب کی ضرورتیں ہوتی ہیں اور ہم سب کی چاہتیں ہوتی ہیں۔ ہماری حقیقی مصیبت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنی چاہتوں کو اپنی ضرورتوں میں بدل دیتے ہیں، اور اپنی واحد حقیقی ضرورت (یعنی اللہ) کو ایک ایسی چیز (نعوذ باللہ) سمجھ لیتے ہیں جس کے بغیر ہم اپنے تئیں گزارا کر سکتے ہیں۔ ہماری حقیقی مصیبت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم اسباب کو مقصود کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ واحد مقصود اللہ کی ذات ہے۔ باقی ہر چیز کا شمار اسباب میں ہوتا ہے۔ ہماری کٹھنائیوں کا آغاز اسی لمحے ہو جاتا ہے جب ہم مقصود سے نگاہ ہٹا کر، اسباب میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

درحقیقت، تحفے کا حقیقی مقصد ہی ہمیں خدا تک پہنچانا ہوتا ہے۔تحفہ بھی ایک وسیلہ ہے۔ مثال کے طور پر، کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں کہا کہ نکاح نصف دین ہے؟ کیوں؟ اگر اسے صحیح طریقے سے بروئے کار لایا جائے تو اس زندگی کے بہت کم حصے ایسے ہیں جو انسان کی کردار سازی پر اس سے زیادہ جامع اثر مرتب کر سکتے ہیں۔ آپ صبر، تشکر، رحم، انکسار، فیاضی، ترکِ نفس اور ایثار جیسے اوصاف کے بارے میں پڑھ سکتے ہیں، لیکن ان کا حصول اسی وقت ممکن ہوگا جب آپ کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوں گے جس میں ان اوصاف کی آزمائش ہوگی۔

شادی جیسے تحائف آپ کو خدا کے نزدیک لانے کا ایک ذریعہ ہیں...... جب تک انہیں ذریعہ ہی سمجھا جائے، بجائے خود مقصود تصور نہ کر لیا جائے۔ خدا کا دیا ہوا تحفہ، اس تک رسائی کا ایک ذریعہ رہے گا تاوقتیکہ اسے ہاتھ میں رکھا جائے، دل میں جگہ نہ دے دی جائے۔ یاد رکھئے کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہوتا ہے، وہ آپ کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ وہ چیز بن جاتا ہے جس کے لئے آپ جان مارتے ہیں اور جس کے حصول کے لئے، جسے اپنا بنائے رکھنے کے لئے، سب کچھ تیاگ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز بن جاتا ہے جس پر آپ نہایت بنیادی انداز میں تکیہ کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا، یہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو دائمی ہو، انتھک ہو، اور ناقابل

شکست ہو۔ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو کبھی آپ سے جدا نہ ہو۔ اور ایسی چیز صرف اللہ کی، خالق و مالک کی ذات ہی ہوسکتی ہے۔

چھت پر امن

ہر انسان کی زندگی میں شدت کے حامل لمحے آتے ہیں۔ میرے لئے ایسا ایک لمحہ اس وقت آیا جب میں مسجد الحرام کی چھت پر کھڑی تھی۔ میرے اوپر صرف آسمان تھا، میرے نیچے، کعبہ کا حسین ترین منظر اور اللہ کی، اس زندگی کی، اور آنے والی زندگی کی ایک نہایت واضح علامت۔ میں ایک بے پناہ ہجوم میں گھری ہوئی تھی...... جو روئے زمین پر کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا...... لیکن میرے لئے سماں ایسا ہی تھا جیسے میں تن تنہا کھڑی ہوں۔ صرف اللہ کی ہمراہی میں۔

میں اس چھت پر بہت سے دُکھ، پریشانیاں اور شکوک لے کر پہنچی تھی۔ میرا دامن کمزوریوں، بے ثباتیوں اور تکالیف سے بھرا ہوا تھا۔ میری زندگی ایک دوراہے پر کھڑی تھی، مجھے آنے والے کل کا اندیشہ لاحق تھا، اور کچھ امیدیں بھی تھیں۔ لہٰذا مجھے موسیٰ علیہ السلام کی کہانی یاد آئی، جو اسی طرح بحیرۂ احمر کے کنارے کھڑے تھے جیسے میں اس چھت پر کھڑی تھی۔ ان کی مادی آنکھوں کو پانی کی ایک دیوار کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا، جس نے ان کی راہ روک رکھی تھی اور عقب میں دشمن کی فوج نزدیک آ رہی تھی، مگر ان کی روحانی آنکھوں کو صرف اللہ نظر آ رہا تھا، اور بچ نکلنے کا اتنا یقینی راستہ جیسے وہ اسے پہلے ہی عبور کر چکے ہوں۔ ان کی قوم کی یقین و امید سے خالی آوازیں صرف پکڑے جانے کا گلہ کر رہی تھیں، مگر موسیٰ علیہ السلام کے قدم ڈگمگائے نہیں۔

وہاں پر کھڑے کھڑے دور سے آنے والی آوازیں مجھے آنے والے کل سے ڈرا رہی تھیں، لیکن میرا دل صرف یہ سن رہا تھا:

''بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ دکھائے گا۔''

(سورۂ الشعرا:٦٢)

تاہم، مصیبت، پریشاں خیالی اور تکالیف کے جو وا ہے ہمیں گھیرے رکھتے ہیں، ان کے پار صرف اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب ہم اپنے دل کو یکسو ہونے کی اجازت دیں۔ توحید

اسلام کی بنیاد ہے، لیکن توحید کا مطلب صرف یہ اقرار کر لینا نہیں کہ خدا ایک ہے۔ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اس کا تعلق مقصد، خوف، پرستش، خدا کے لئے حتمی محبت کی وحدانیت سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی نظر ایک واحد نقطے پر مرکوز کر کے باقی ہر چیز کو اپنے اپنے مقام پر آنے دیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوبصورت ترین احادیث میں سے ایک نہایت جامع انداز میں اس تصور کا احاطہ کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> ''جو کوئی آخرت کی دُھن میں رہتا ہے، اللہ اس کے دل کو خواہشوں سے آزاد کر دیتا ہے، اس کے امور مجتمع کر دیتا ہے، اور دنیا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پاس آ جاتی ہے۔ اور جو کوئی دنیا کی دُھن میں رہتا ہے، تو اللہ اس کی مفلسی کو اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے، اس کے معاملات منتشر کر دیتا ہے، اور دنیا سے اسے صرف اتنا ہی ملتا ہے جتنا کہ اس کے لئے لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔'' (جامع ترمذی)

اگر آپ نے کبھی ''میجک آئی'' (magic eye) والی تصویر دیکھی ہو، تو آپ اس صداقت کا ایک شاندار استعارہ دیکھ سکتے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ تصویر مختلف طرح کی ساختوں کے ایک مجموعے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتی، نہ اس میں کوئی ترتیب نظر آتی ہے اور نہ اس کا کوئی مقصد واضح ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ تصویر کو اپنے چہرے کے نزدیک لاتے ہوئے اپنی نگاہوں کو ایک نقطے پر مرکوز کریں، اور پھر تصویر کو آہستہ آہستہ اپنی آنکھوں سے دور کرتے جائیں، تو یک لخت تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم، جیسے ہی آپ اس واحد نقطہ ارتکاز سے اپنی نگاہیں ہٹاتے ہیں، تصویر غائب ہو جاتی ہے اور ایک بار پھر ساختوں کے ایک سمندر کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

اسی طرح ہم دنیا پر جتنا زیادہ فوکس کرتے ہیں، ہمارے معاملات اتنے ہی منتشر ہوتے جاتے ہیں۔ ہم دنیا کے پیچھے جتنا بھاگتے ہیں، یہ اتنا ہی ہم سے دور بھاگتی ہے۔ کیسی الٹی بات ہے کہ ہم دولت کی جتنی زیادہ تمنا کرتے ہیں، اپنی غربت کا احساس اتنی ہی شدت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کا فوکس دولت پر ہے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ خواہ آپ کتنا ہی روپیہ پیسہ کیوں نہ

اکٹھا کرلیں، اسے کھو دینے کا خوف ہمیشہ آپ کے دل پر سوار رہے گا۔ یہ تمنا بجائے خود مفلسی ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مفلسی ہمیشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کا خزانہ چاہے کتنا ہی بھرا ہوا کیوں نہ ہو، ان کی تسلی نہیں ہوتی، مزید کی طمع اور کھو دینے کا خوف ہمیشہ انہیں گرفت میں لئے رکھتا ہے۔ لیکن جن کی توجہ کا مرکز اللہ کی ذات ہوتی ہے، دنیا خود چل کر ان کے پاس آتی ہے، اور اللہ ان کے دلوں کو اطمینان وسکون سے بھر دیتا ہے۔ ان کے پاس کم بھی ہو تو وہ خود کو امیر محسوس کرتے ہیں، اور اپنی دولت میں دوسروں کو شریک کرنے پر زیادہ آمادہ رہتے ہیں۔

اور جب ایسے لوگوں کے لئے زندگی بوجھل ہونے لگتی ہے، مالی مشکلات، تکالیف، تنہائی، خوف، دل شکنی یا غم انہیں ستانے لگتے ہیں تو انہیں صرف اتنا کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کریں، اور وہ ہمیشہ ان کے لئے راہیں کھول دیتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ محض دل بہلانے کا کوئی نظریہ نہیں۔ یہ ایک وعدہ ہے۔ ایک ایسا وعدہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''......اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لئے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے، اور اسے وہاں سے روزی دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اس کے لئے کافی ہے......'' (سورہ طلاق: ۳-۲)

اللہ ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اللہ ہی کافی ہے۔ ان کے لئے جو اپنا مطلوب ومقصود اللہ کو بناتے ہیں، ان کے لئے امن وسکون ہے، کیونکہ اس زندگی میں ان کے ساتھ جو بھی ہوتا ہے، اچھا ہوتا ہے اور وہ اسے اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ایک ایسی زندگی کا تصور کیجئے جس میں آسانیاں ہی آسانیاں ہوں۔ مومن کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے:

''مومن کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے لئے اپنے تمام معاملات میں خیر ہوتی ہے، اور یہ صرف مومن کے لئے ہے۔ جب اس

کے ساتھ کچھ اچھا ہوتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے، اور جب اسے کوئی ناگوار صورت پیش آتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے، اور یہ اس کے لئے اچھا ہے۔
(صحیح مسلم)

اور اس طرح ایسے مومن کے دل میں ایک طرح کی جنت آباد ہو جاتی ہے۔ یہ وہ جنت ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا تھا:

''یقیناً اس دنیا میں ایک جنت ہے (اور) جو کوئی اس میں داخل نہیں ہوتا، وہ آخرت کی جنت سے بھی محروم رہے گا۔''

اور جنت میں کامل امن وسکون کوئی لمحاتی نہیں بلکہ دائمی کیفیت ہوتا ہے۔

دنیا کا سمندر

کل میں ساحل سمندر پر گئی۔ میں بیٹھی کیلی فورنیا کے ساحل سے لہروں کو ٹکراتے دیکھ رہی تھی کہ مجھے ایک عجیب سی حقیقت کا احساس ہوا۔ سمندر دم بخود کر دینے کی حد تک خوبصورت ہوتا ہے۔ مگر یہ جتنا خوبصورت ہے، اتنا ہی جان لیوا بھی ہے۔ یہ مسحور کن موجیں، جنہیں ہم ساحل پر بیٹھ کر تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اگر ہم ان میں داخل ہو جائیں تو ہمیں ہلاک بھی کر سکتی ہیں۔ پانی، وہ عنصر جو زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، زندگی کو ڈبو کر ختم بھی کر سکتا ہے۔ اور سمندر جن کشتیوں کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، انہیں پاش پاش بھی کر سکتا ہے۔

یہ دنیاوی زندگی بھی سمندر کی طرح ہے۔ اور ہمارے دل کشتیوں کی مانند ہیں۔ ہم سمندر کو اپنی ضرورتوں کے لئے اور اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے راستے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر سمندر کی حیثیت بس ایک ذریعے کی ہی ہے۔ یہ سمندر سے خوراک حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ سفر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ کسی اعلیٰ تر مقصد کو ڈھونڈنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم صرف گزرتے ہیں، کبھی اس میں قیام کرنے کا نہیں سوچتے۔ ذرا تصور کیجئے کہ اگر سمندر محض ایک ذریعہ رہنے کے بجائے ہمارا مطلوب ومقصود بن جائے تو کیا ہو۔

انجام کار ہم ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے۔

جب تک سمندر کا پانی کشتی سے باہر رہے، کشتی تیرتی رہے گی اور کنٹرول میں رہے گی۔ لیکن جیسے ہی پانی کشتی میں داخل ہونا شروع ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ جب دنیا محض ہمارے دلوں سے باہر بہنے والا پانی نہیں رہتی، جب دنیا محض ایک ذریعہ نہیں رہتی تو کیا ہوتا ہے؟ جب دنیا ہمارے دلوں میں داخل ہو جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟

تب کشتی ڈوب جاتی ہے۔

تب دل قیدی ہو جاتا ہے اور غلام بن جاتا ہے۔ اور تب دنیا...... جو کہ ایک وقت میں ہمارے کنٹرول میں تھی......ہمیں کنٹرول کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جب سمندر کا پانی ایک کشتی میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو جاتا ہے تو کشتی کنٹرول میں نہیں رہتی۔ تب یہ سمندر کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔

تیرتے رہنے کے لئے ہمیں دنیا کو بالکل اسی انداز میں دیکھنا چاہیئے کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ:

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (سورہ آلِ عمران: ۱۹۰)

ہم دنیا میں رہتے ہیں لیکن درحقیقت دُنیا ہمارے استعمال کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ دنیا سے علیحدگی (زہد) کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دنیا کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔ اس کے بجائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہمیں دنیا کے ساتھ تعلق رکھنا چاہیئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ''تین صحابہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے ہاں آئے اور ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کیسے عبادت کرتے ہیں۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہیں شاید یہ کم معلوم ہوا اور انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں ہماری کیا حیثیت ہے، ان کی تو اگلی پچھلی غلطیاں معاف کر دی گئی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''میں ہر روز پوری پوری رات نماز پڑھا کروں گا۔'' دوسرے نے کہا۔ ''میں تمام عمر روزے رکھوں گا، اور کبھی روزہ نہ کھولوں گا۔'' تیسرے نے کہا۔ ''میں عورتوں سے تعلق ختم کر لوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔'' رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''کیا

تمہی وہ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ اللہ کی قسم، میں تم سب سے بڑھ کر اللہ کا خوف اور اللہ سے آگاہی رکھتا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور کھولتا بھی ہوں۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو کوئی میری سنت پر عمل نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (متفق علیہ)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے وابستگی ختم کرنے کے لئے اس سے قطع تعلق نہیں کیا۔ ان کی علیحدگی اس سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ انہوں نے اپنے دل سے دنیا کی محبت نکال دی تھی۔ ان کی حتمی وابستگی صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے تھی اور ان کے دل میں صرف اللہ کا بسیرا تھا، کیونکہ وہ اللہ کے اس فرمان کا حقیقی مفہوم سمجھتے تھے:

> ''اور دنیا کی یہ زندگانی تو محض کھیل تماشا ہے، البتہ آخرت کے گھر کی زندگی حقیقی زندگی ہے، کاش یہ جانتے ہوتے۔'' (سورہ العنکبوت: ۶۴)

دنیا سے علیحدگی اختیار کر لینے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم دنیاوی چیزیں اپنی ملکیت میں نہیں رکھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی جلیل القدر اصحابؓ دولتمند تھے۔ اس کے بجائے، دنیا سے علیحدگی کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھیں اور اسی اعتبار سے اس سے تعلق رکھیں یعنی اسے محض ایک ذریعہ سمجھیں، مقصود نہیں۔ جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا: ''علیحدگی اختیار کر لینے کے مطلب یہ نہیں کہ آپ کی ملکیت میں کچھ نہ ہو، بلکہ یہ کہ کوئی چیز آپ کی مالک نہ بنے۔''

کشتی میں داخل ہونے والے سمندر کے پانی کی طرح، جیسے ہی ہم دنیا کو اپنے دلوں میں داخل ہونے کی اجازت دیں گے، ہم ڈوب جائیں گے۔ کشتی میں سمندر کے پانی کی جگہ نہیں ہوتی، یہ محض ایک ذریعہ ہے جسے کشتی سے باہر ہی رہنا چاہئے۔ دنیا کی تخلیق بھی اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ یہ ہمارے دلوں میں داخل ہو جائے۔ یہ محض ایک ذریعہ ہے جسے نہ ہمارے دلوں میں داخل ہونا چاہئے اور نہ ہمارا حاکم بننا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ نے بار بار دنیا کے لئے ''متاع'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ ''متاع'' کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا جا سکتا ہے: ''عارضی دنیاوی خوشی کے لئے اختیار کیا جانے والا ذریعہ۔'' یہ ایک ذریعہ ہے۔ یہ

ایک آلہ ہے۔ یہ راستہ ہے، منزل نہیں۔

اور یہی وہ تصور ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان کیا:

> ''میرا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ میں اس دنیا میں ایک سوار کی طرح ہوں جو ایک درخت کی چھاؤں میں دم بھر کو ٹھہر گیا ہو، اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر سے اپنے راستے پر چل پڑے اور درخت کو پیچھے چھوڑ جائے۔'' (مسند احمد، ترمذی)

ایک لمحے کے لئے ''مسافر'' کے استعارے پر غور کیجئے۔ جب آپ سفر کر رہے ہوتے ہیں یا جب آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قیام محض عارضی نوعیت کا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ جب آپ ایک رات کے لئے ایک شہر سے گزر رہے ہوتے ہیں، تو اس سے آپ کتنا گہرا تعلق اختیار کرتے ہیں؟ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آپ کا قیام عارضی ہے تو آپ موٹل نمبر 6 میں ٹھہرنے پر آمادہ ہوں گے۔ لیکن کیا آپ وہاں رہنا چاہیں گے؟ غالباً نہیں۔ فرض کیجئے آپ کا باس آپ کو کسی محدود مدت کے پراجیکٹ پر کام کرنے کے لئے کسی نئے شہر میں بھیج دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ وہ آپ کو بتاتا نہیں کہ پراجیکٹ کب ختم ہوگا لیکن آپ کو معلوم تھا کہ کسی بھی روز آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ آپ اس شہر میں زندگی کیسے گزاریں گے؟ کیا آپ وہاں بہت سی زمین جائیداد خرید لیں گے اور اپنی ساری جمع پونجی مہنگے فرنیچر اور گاڑیوں پر خرچ کر دیں گے؟ قوی امکان ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ خریداری کرتے ہوئے بھی، کیا آپ چھکڑوں کے حساب سے کھانے پینے کا سامان اور دیگر خراب ہو جانے والی چیزیں خریدیں گے؟ نہیں۔ اپنی ایک دو دن کی ضرورت سے زیادہ خریداری کرتے ہوئے غالباً آپ کو ہچکچاہٹ کا سامنا ہوگا، کیونکہ آپ کا باس کسی بھی وقت آپ کو واپس بلا سکتا ہے۔

یہ ایک مسافر کی سوچ ہے۔ جب یہ احساس ہو جائے کہ کوئی چیز عارضی ہے تو فطری طور پر اس سے ایک بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نہایت گہرے مفہوم کی حامل حدیث میں یہی بات بیان کر رہے ہیں۔ انہیں اس زندگی میں منہمک ہو جانے کے

خطرے سے بخوبی آگاہی تھی۔ بلکہ انہیں ہمارے لئے اس سے زیادہ اور کسی چیز کا خطرہ نہ تھا۔

آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

> ''اللہ کی قسم، مجھے تمہارے غریب رہنے کا ڈر نہیں، بلکہ یہ ڈر ہے کہ تم سے پہلے کی قوموں کی طرح تمہیں دنیاوی فراوانیاں مل جائیں گی، اور تم ان کے لئے مسابقت شروع کر دو گے جیسے کہ دوسرے کرتے رہے، لہٰذا یہ تمہیں بھی ویسے ہی برباد کر دے گی، جیسے اس نے دوسروں کو برباد کیا۔'' (متفق علیہ)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس زندگی کی حقیقت کا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا کا حصہ بنے بغیر اس میں رہنے کا مطلب کیا ہے۔ انہوں نے بھی اسی سمندر میں سفر کیا جس میں سے ہم سب کو گزرنا پڑتا ہے۔ مگر ان کی کشتی کو بخوبی علم تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے، اور کہاں جا رہی ہے۔ ان کی کشتی خشک رہی۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ جو سمندر سورج کی روشنی میں جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے، وہ اس میں اترنے والی کشتیوں کے لئے قبرستان بن جائے گا۔

اپنا دل واپس لے لیجئے

کوئی بھی گرنا پسند نہیں کرتا، اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ڈوب مرنے کا فیصلہ کریں۔ مگر اس زندگی کے سمندر سے لڑتے ہوئے، بعض اوقات دنیا کو اپنے دل سے باہر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات سمندر ہماری کشتی میں گھس جاتا ہے۔ بعض اوقات دنیا ہمارے دلوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

اور کشتی کو پارہ پارہ کر دینے والے پانی کی طرح، جب دنیا ہمارے دل میں داخل ہوتی ہے، تو اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ یہ کشتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ حال ہی، مجھے یاد دہانی کرائی گئی کہ ایک ٹوٹی ہوئی کشتی دیکھنے میں کیسی لگتی ہے، جب ہم ہر چیز کو اپنے دل میں داخل ہونے کی اجازت دے دیتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ یہ یاد دہانی اس لئے ہوئی کیونکہ میں نے بالکل اپنے جیسی ایک خاتون کو دیکھا، جس پر اس زندگی کی محبت حد سے زیادہ غالب آ گئی اور وہ اپنے وجود کو مخلوق سے بھرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لہٰذا دنیا کے سمندر نے اس کی کشتی کو

پاش پاش کر دیا، جیسے اس نے میری کشتی کو کیا تھا، اور وہ پانی میں جا گری۔ مگر وہ بہت دیر پانی میں رہی، اور اسے علم نہ تھا کہ واپس اوپر کیسے آیا جائے یا کس سہارے کو تھاما جائے۔

اس لئے وہ ڈوب گئی۔

اگر آپ دنیا کو اپنے دل پر قبضہ جمانے کی اجازت دے دیں، جیسے سمندر کشتی پر قبضہ جما لیتا ہے، تو یہ غالب آ جائے گی۔ آپ سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب جائیں گے۔ آپ سمندر کی تہہ کو چھوئیں گے۔ اور آپ کو لگے گا کہ آپ اپنے پست ترین مقام پر ہیں۔ اپنے گناہوں اور اس زندگی کی محبت میں پھنس کر، آپ کو لگے گا کہ آپ ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں، اور آپ کے چاروں طرف ظلمتوں کا راج ہے۔ سمندر کی تہہ کے بارے میں یہی بات حیران کن ہے۔ یہاں تک کوئی روشنی نہیں پہنچتی۔

تاہم، یہ اندھیرا مقام انجام نہیں۔ یاد رکھئے کہ سورج کی روشنی سے پہلے رات کا اندھیرا آتا ہے۔ اور جب تک آپ کا دل دھڑک رہا ہے، اس کی زندگی باقی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہیں آپ کی موت واقع ہو۔ بعض اوقات، سمندر کی تہہ سفر میں محض ایک پڑاؤ ہوتی ہے۔ اور جب آپ اپنے پست ترین مقام پر ہوتے ہیں، تب آپ کے سامنے فیصلے کی گھڑی آتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسی تہہ میں ٹھہر کر اپنے ڈوبنے کا انتظار کر سکتے ہیں، یا پھر آپ یہاں بکھرے موتی چن کر واپس سطح آب کی طرف لوٹ سکتے ہیں، اس جدوجہد کی بدولت زیادہ طاقتور ہو کر، اور ان موتیوں کی بدولت زیادہ دولتمند ہو کر۔

اگر آپ کو اللہ کی تلاش ہے تو وہ آپ کو اوپر اٹھا سکتا ہے اور سمندر کی تاریکی کو اپنے سورج کی روشنی سے بدل سکتا ہے۔ وہ آپ کی سب سے بڑی کمزوری کو بدل کے آپ کی سب سے بڑی قوت، اور پھلنے پھولنے، پاکیزہ ہونے اور نجات پانے کا ایک ذریعہ بنا سکتا ہے۔ جان لیجئے کہ تبدیلی کا عمل بعض اوقات گرنے سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے گرنے کو برا نہ جانیے۔ عاجزی وانکساری زمین پر ہی ملتی ہے۔ اسے لے لیجئے۔ اسے سیکھ لیجئے۔ اسے اپنی سانسوں میں اتار لیجئے۔ اور پھر زیادہ طاقتور، زیادہ منکسر اور خدا کے لئے اپنی ضرورت سے زیادہ باخبر ہو کر واپس آ جیئے۔ اپنی پستی اور اپنے رب کی عظمت کو پہچان کر واپس آ جیئے۔ جان لیجئے کہ اگر آپ

نے یہ حقیقت دیکھ لی ہے تو آپ نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں فریب خوردہ وہی ہوتا ہے جو اپنی ذات کو دیکھتا ہے، مگر اپنے رب کی ذات سے غافل رہتا ہے۔ حقیقی معنوں میں محروم وہی ہوتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسے خدا کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اپنے وسائل پر تکیہ کر کے وہ بھول جاتا ہے کہ وسائل، اس کی اپنی روح، اور دیگر ہر مخلوق خدا کی بنائی ہوئی ہے۔

واپس اوپر آنے کے لئے خدا سے رجوع کیجئے کیونکہ جب وہ آپ کو اٹھائے گا تو وہ آپ کی کشتی دوبارہ بنا دے گا۔ جس دل کے بارے میں آپ کا گمان تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ ہوگیا ہے، وہ جڑ جائے گا۔ جب بکھر گیا تھا وہ مجتمع ہو جائے گا۔ جان لیجئے کہ صرف اللہ ہی ایسا کرسکتا ہے۔ اس سے رجوع کیجئے۔

اور جب وہ آپ کو بچالے تو گرنے کے لئے گڑگڑا کر اس سے معافی مانگئے، اس پر پچھتاوا محسوس کیجئے، مگر مایوس نہ ہوئیے۔ جیسا کہ ابن قیمؒ نے کہا ہے: ''جب آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو شیطان بہت خوش ہوا، لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ جب کوئی غوطہ خور سمندر کی گہرائی میں اترتا ہے تو وہ موتی سمیٹ کر پھر سے ابھر آتا ہے۔''

توبہ کرنا اور اللہ کی طرف لوٹ آنا بڑا جاندار اور حیران کن عمل ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ دل کو صیقل کرتا ہے۔ صیقل کرنے کے عمل کے حوالے سے حیران کن بات یہ ہے کہ یہ محض صاف نہیں کرتا، بلکہ صیقل ہونے والی چیز کو اس سے بھی کہیں زیادہ چمکدار بنا دیتا ہے جتنا کہ یہ گندا ہونے سے پہلے تھی۔ اگر آپ اللہ کی طرف لوٹ آئیں، اس کی مغفرت کے طلب گار ہوں اور اپنی زندگی اور اپنے دل کو اس کے حوالے سے ایک بار پھر یکسو کریں، تو ممکن ہے آپ ایسے دولتمند ہو جائیں جیسے آپ کبھی گرے ہی نہ تھے۔ بعض اوقات گرنے اور پھر اٹھ کھڑے ہونے سے آپ کو دانش اور عجز و انکسار کی وہ دولت حاصل ہو جاتی ہے جو بصورتِ دیگر شاید آپ کو کبھی نہ ملتی۔ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''اسلاف میں سے ایک کا کہنا ہے: ''بے شک بعض اوقات کوئی بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی بدولت جنت میں چلا جاتا ہے، اور کوئی دوسرا بندہ نیکی کرتا ہے اور اس کی بدولت جہنم میں جا گرتا ہے۔'' پوچھا گیا: یہ کیسے ہوتا ہے؟ پس انہوں نے جواب دیا: ''جس نے گناہ کیا وہ

وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، جس کی بدولت اس کے دل میں اس کا خوف پیدا ہونے لگتا ہے، وہ اس پر پچھتانے لگتا ہے، آنسو بہانے لگتا ہے اور اس کی وجہ سے خود کو اپنے رب جل جلالہ کے سامنے شرمسار محسوس کرتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل اور عاجزی سے جھکے ہوئے سر کے ساتھ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ گناہ اس کے لئے کئی نیکیوں سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی بدولت اس نے عاجزی و انکسار کا سبق سیکھا...... جس کی بدولت بندے کو مسرت و کامیابی حاصل ہوئی...... اس حد تک کہ اس کا گناہ اس کے جنت میں داخلے کا ذریعہ بن گیا۔ جہاں تک نیکی کرنے والے کا سوال ہے، پھر وہ اس نیکی کو اپنے رب کے کرم کی بدولت نہیں سمجھتا، اس کے بجائے وہ تکبر کا شکار ہو کر خود پر حیران ہوتا ہے اور کہتا ہے: میں نے یہ یہ چیز حاصل کر لی۔ اس طرح وہ اور بھی خود بین، متکبر اور مغرور ہو جاتا ہے...... یہاں تک کہ یہ چیز اس کی بربادی کا باعث بن جاتی ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن میں ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کبھی امید کا دامن نہ چھوڑو۔ فرمانِ الٰہی ہے:

> ''(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش، بڑی رحمت والا ہے۔'' (سورہ الزمر: ۵۳)

اور لہٰذا، یہ ان سب کے لئے ایک ندا ہے جو اپنے نفس کے غلام بن گئے ہیں، اپنے نفس اور خواہشات کی کال کوٹھڑی میں قید ہیں۔ یہ ان سب لوگوں کے لئے ایک ندا ہے جو دنیا کے سمندر میں اترے ہیں، جو اس کی گہرائیوں میں ڈوب چکے ہیں، اور جو اس کی دیو قامت موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ ابھر آؤ۔ ابھر کر کھلی ہوا میں لوٹ آؤ، سمندر کے قید خانے کے اوپر واقع حقیقی دنیا میں لوٹ آؤ۔ ابھر کر آزادی حاصل کر لو۔ ابھر کر زندگی حاصل کر لو۔ اپنی روح کی موت کو پیچھے چھوڑ دو۔ تمہارا دل اب بھی زندہ ہو سکتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور پاکیزہ ہو سکتا ہے۔ کیا توبہ کا صیقل دل کو پہلے سے زیادہ خوبصورت نہیں بنا دیتا؟ اس پردے کو ہٹا

دو جس کا تانا بانا تمہارے گناہوں سے مل کر بنا ہے۔ حقیقی زندگی اور اپنے درمیان، آزادی اور اپنے درمیان، روشنی اور اپنے درمیان، اللہ اور اپنے درمیان پڑے پردے کو ہٹا دو۔ اس طرف لوٹ آؤ جہاں سے تمہاری شروعات ہوئی تھی۔ گھر لوٹ آؤ۔ جان لو کہ جب سب دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ایک دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ہمیشہ۔ اسے تلاش کرو۔ اللہ سے رجوع کرو، وہ تمہیں اس بے رحم سمندر کی موجوں سے گزار کر سورج کی رحمت میں لے جائے گا۔

جب تک آپ کی اجازت نہ ہو، یہ دنیا آپ کو توڑ نہیں سکتی۔ اور جب تک آپ خود اس کے ہاتھ میں چابیاں نہ تھمائیں، خود اپنا دل اس کے حوالے نہ کریں، یہ آپ پر قابض نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر تم نے کچھ وقت کے لئے چابیاں دنیا کو دے دی تھیں تو انہیں واپس لے لو۔ یہ انجام نہیں۔ ضروری نہیں کہ تمہاری موت یہیں واقع ہو۔ اپنا دل بازیاب کرا لو اور اسے اس کے حقیقی مالک کے حوالے کر دو۔

اللہ کے حوالے کر دو۔

☆☆☆

محبت

بدترین قید خانے سے فرار

جب سارہ کی ملاقات احمد سے ہوئی تو اس کے دل نے فوراً گواہی دے دی۔ اس میں ہر وہ چیز تھی جس کا سارہ نے خواب دیکھا تھا۔ اس سے ملاقات ایسے ہی تھے جیسے برف کے طوفان کے عین درمیان ابھرتے سورج کا نظارہ دکھائی دے جائے۔ اس کی گرمجوشی نے برف کو پگھلا دیا۔ تاہم، جلد ہی یہ تحسین، پرستش میں تبدیل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتی کہ کیا ہو رہا ہے، سارہ قیدی بن گئی۔ وہ اپنی خواہش اور اپنے محبوب کی طلب کی قیدی بن گئی۔ وہ جہاں دیکھتی، اسے اپنے محبوب کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ اس کا محبوب اس سے ناراض ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی احساس باقی نہ رہا تھا، اور اس کے بغیر خوشی کا کوئی مطلب نہ تھا۔ اس سے جدا ہو کر اسے یوں لگتا جیسے اس کے جسم سے روح کھینچی جا رہی ہو۔ سارہ کے دل میں صرف اس کا چہرہ تھا، اور اس سے بڑھ کر کوئی ہستی اسے اپنے قریب محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ اس کے لئے رگوں میں دوڑتے خون کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے بغیر جینے کی تکلیف نا قابل برداشت تھی کیونکہ اس کی رفاقت کے بغیر خوشی کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

سارہ کا خیال تھا کہ وہ محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

سارہ نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ عنفوانِ شباب میں ہی اس کا باپ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا، اور سولہ سال کی عمر میں وہ خود گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ منشیات اور شراب کی لت کے خلاف جدوجہد کرتی رہی تھی۔ وہ جیل میں بھی وقت گزار چکی تھی۔ تاہم، یہ ساری تکالیف مل کر بھی اس تکلیف کے برابر نہ ہو سکتی تھیں، جس کا سامنا اسے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس نئے قید خانے میں کرنا پڑا۔ سارہ اپنی خواہشات میں مقید ہو کر رہ گئی۔ ابن تیمیہؒ نے جب یہ کہا تو وہ اسی قید کے بارے میں بات کر رہے تھے:

> ''حقیقی معنوں میں قیدی وہ ہے جس کا دل اللہ سے دوری کی قید میں ہے اور غلام وہ ہے، جسے اس کی خواہشات نے غلام بنا رکھا ہے۔''

(ابن قیم، الوابل، ص 69)

احمد کے لیے سارہ کی پرستش کی اذیت اس کے تمام گزشتہ مصائب کی اذیت سے زیادہ شدید تھی۔ یہ اس پر پوری طرح سے غالب آ گئی لیکن کبھی اس کی تسکین نہ کر سکی۔ صحرا میں پھنسے تشنہ لب کی طرح، سارہ پاگلوں کی طرح ایک سراب کے تعاقب میں بھاگ رہی تھی۔ لیکن جو چیز زیادہ بری تھی، وہ اس جگہ پر کسی اور کو بٹھا دینے کا اذیت ناک نتیجہ تھا جس جگہ پر کہ صرف اللہ کو ہونا چاہئے۔

سارہ کی کہانی نہایت گہرا مفہوم رکھتی ہے کیونکہ یہ حیات کی ایک عمیق صداقت کو آشکار کرتی ہے۔ بطور انسان، ہمیں ایک مخصوص فطرت پر تخلیق کیا گیا ہے۔ خدا کی وحدانیت کو پہچاننا اور اپنی زندگیوں میں اس صداقت کو مجسم کرنا ہماری فطرت ہے۔ لہٰذا کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمیں اس سے زیادہ اذیت دے جو کہ ہمیں اس وقت پہنچتی ہے جب اپنی زندگی میں یا اپنے دل میں کسی کو خدا کے برابر ٹھہرا لیتے ہیں۔ شرک کسی بھی سطح کا ہو، انسانی روح کو یوں توڑ ڈالتا ہے کہ کوئی اور المیہ اسے اس انداز میں توڑ نہیں سکتا۔ کسی چیز سے یوں محبت کی جائے، یوں مقدس ٹھہرایا یا اس کے سامنے یوں سجدہ ریز ہوا جائے جیسا کہ صرف خدا کے سامنے ہونا چاہئے تو روح مڑ تڑ کر ایک ایسی شکل میں ڈھل جاتی ہے جو کہ اس کی فطرت میں ہی نہیں۔ اس صداقت کی حقیقت کو دیکھنے کے لئے، صرف اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ جب کسی انسان سے اس کا معبود چھن جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔

22 جولائی 2010ء کو ٹائمز آف انڈیا میں خبر چھپی کہ ایک چالیس سالہ عورت نے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کے اور آگ لگا کے خودکشی کر لی ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ بادی النظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خودکشی ''شادی کے انیس سالوں میں اولاد پیدا نہ کر پانے کے صدمے کے تحت لیا گیا انتہائی قدم ہے۔''

صرف چند دن پہلے، 16 جولائی کو پولیس نے رپورٹ دی کہ ایک 22 سالہ بھارتی نوجوان نے محبوبہ کے چھوڑ جانے کے غم میں خودکشی کر لی۔''

[illegible] لوگ ان دو مرنے والوں کے غم کو سمجھ سکتے ہیں اور اگر ایسی صورت حال پیش آ [illegible] لوگوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اگر ہماری زندگی کا مقصد ایک بچہ پیدا کرنا یا

کسی مخصوص فرد کو اپنی زندگی میں شامل رکھنا ہے تو پھر کہیں کچھ بہت غلط ہے۔ اگر کوئی متناہی، عارضی اور مرجھا جانے والی چیز ہماری زندگی کا مرکز بن جاتی ہے، ہمارے جینے کا مقصد بن جاتی ہے، تو ہم ضرور بالضرور ٹوٹ کے رہیں گے۔ جس ناقص وجود کو ہم اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں، وہ، اپنی فطرت کے مطابق، ماند پڑ جائے گا، ہمیں مایوس کرے گا یا مر جائے گا۔ اور جیسے ہی ایسا ہوگا، ہم ٹوٹ جائیں گے۔ اگر پہاڑ پر چڑھتے ہوئے آپ کسی نازک سی شاخ کو تھام کر اس پر اپنا پورا بوجھ ڈال دیں تو کیا ہوگا؟ طبیعات کے قوانین ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ شاخ، جسے اتنا بوجھ اٹھانے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا تھا، ٹوٹ جائے گی۔ کشش ثقل کے قوانین ہمیں بتاتے ہیں کہ تب ہم ضرور بالضرور گر پڑیں گے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں۔ یہ طبیعاتی دنیا کی ایک حتمی حقیقت ہے۔ روحانی دنیا میں بھی یہ حقیقت حتمی حیثیت رکھتی ہے، اور ہمیں قرآن میں اس کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، ذرا کان لگا کر سن لو! اللہ کے سوا جن جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے گو سارے کے سارے ہی جمع ہو جائیں، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز لے بھاگے تو یہ تو اسے بھی اس سے چھین نہیں سکتے، بڑا کمزور ہے طلب کرنے والا اور بڑا کمزور ہے وہ جس سے طلب کیا جا رہا ہے۔'' (سورہ الحج: ۷۳)

یہ آیہ مبارکہ نہایت گہرے مفہوم کی حامل ہے۔ جب بھی آپ کسی کمزور (اللہ کے سوا ہر چیز اپنی فطرت میں کمزور ہے) چیز کے پیچھے بھاگیں، اس کے تمنائی ہوں یا اسے پکاریں تو آپ بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ جس کی آپ کو طلب ہے، آپ اسے حاصل کر بھی لیں تو یہ کبھی کافی ثابت نہیں ہوگی۔ آپ کو جلد ہی کسی اور چیز کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کو کبھی حقیقی اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ''ادلے بدلے'' اور ''اپ گریڈز'' سے بھری پڑی ہے۔ آپ کا فون، آپ کی کار، آپ کا کمپیوٹر، آپ کی بیوی، آپ کا شوہر، انہیں دے کر بدلے میں آپ ہمیشہ ایک زیادہ جدید، زیادہ بہتر ''ماڈل'' حاصل کر سکتے ہیں۔

تاہم، اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کی ایک صورت ہے۔ جب جس پر آپ اپنا پورا بوجھ ڈالیں، وہ غیر متزلزل، نا قابل شکست، اور لامتناہی ہو تو پھر آپ گر نہیں سکتے۔ آپ ٹوٹ نہیں سکتے۔ اللہ قرآن میں اس صداقت کی وضاحت کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> "دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، دلالت سے روشن ہو چکی ہے اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا، اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"
>
> (سورہ البقرہ:۲۵۶)

جس کا سہارا آپ لیتے ہیں، جب وہ مضبوط ہوتا ہے تو آپ بھی مضبوط ہو جاتے ہیں، اور اس قوت کی بدولت آپ کو سب سے حقیقی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ابن تیمیہؒ نے اس آزادی کا بیان کرتے ہوئے کہا:

> "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میرا جنت اور میرا باغ دونوں میرے دل میں ہیں۔ میں سفر کرتا ہوں تو وہ میرے ساتھ ہوتے ہیں، کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوتے۔ قید میرے لئے اپنے اللہ کے ساتھ خلوت حاصل کرنے کا ایک موقع ہے۔ مار دیئے جانا میرے لئے شہادت ہے اور جلاوطن کر دیئے جانا میرے لئے ایک روحانی سفر ہے۔" (ابن قیم، الوابل، ص ۶۹)

اپنا معبود اسے بنا کر جو بے عیب ہے، لامتناہی ہے اور کسی کمزوری سے پاک ہے، ابن تیمیہؒ نے اس زندگی کے قید خانے سے رہائی کا ایک طریقہ بیان کیا۔ انہوں نے ایک ایسے مومن کا احوال بیان کیا جس کا دل آزاد ہے۔ یہ ایک ایسا دل ہے جو اس زندگی اور اس میں شامل ہر چیز کی غلامی سے آزاد ہے۔ یہ ایک ایسا دل ہے جو جانتا ہے کہ واحد حقیقی المیہ توحید پر سمجھوتہ کر لینا ہے، جو جانتا ہے کہ واحد نا قابل تسخیر مصیبت معبودِ حقیقی کے علاوہ کسی اور چیز یا کسی اور شخص کی پرستش کرنا ہے، جو جانتا ہے کہ واحد حقیقی قید خانہ کسی اور چیز کے اللہ کے مقام پر لا بٹھانے کا قید

خانہ ہے۔ خواہ وہ چیز انسان کی اپنی خواہشات ہوں، اس کا نفس ہو، اس کی مال و دولت، کام کاج، بیوی بچے، یا اپنی زندگی سے محبت ہو، یہ جھوٹا خدا آپ کو پھنسا لے گا اور غلام بنا لے گا، اگر آپ اسے قطعی و حتمی سمجھ لیں۔ اس غلامی کا کرب اس زندگی کے تمام مصائب کے کرب سے زیادہ بڑا، زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا ہوگا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے تجربے کو اپنے ذہن میں بٹھانا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں تھے، تو ان کے پاس باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا، اور وہ یہ کہ پوری طرح سے اللہ سے رجوع کیا جائے، اللہ کی توحید اور اپنی انسانی کمزوری کا ادراک کیا جائے۔ آپ کی دعا اس صداقت کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتی ہے:

''تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک مجھ سے بے جا ہوا۔''

(سورہ الانبیاء: ۸۷)

ہم میں سے بہت سے بھی اپنی خواہشات اور جھوٹے معبودوں کی مچھلی کے پیٹ میں قید ہیں۔ ہم اپنے نفس کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ قید اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنے دلوں میں اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کو جگہ دے دی ہے۔ ایسا کر کے ہم کسی بھی دنیاوی قید خانے سے زیادہ برا اور زیادہ اذیت ناک قید خانہ تشکیل دیتے ہیں، کیونکہ دنیاوی قید خانہ ہم سے وہی کچھ چھین سکتا ہے جو عارضی اور اپنی اصل میں ناقص ہے، لیکن یہ روحانی قید خانہ ہم سے وہ چھین لیتا ہے جو حتمی و قطعی ہے، لامتناہی ہے اور کسی بھی عیب سے پاک ہے یعنی اللہ اور اس کے ساتھ ہمارا تعلق۔

کیا مجھے محبت ہو گئی ہے؟

''محبت ایک سنگین ذہنی مرض ہے۔'' کم از کم افلاطون نے تو یہی کہا تھا۔ اور اگرچہ جس کسی نے بھی کبھی ''محبت'' کی ہے، اسے اس بیان میں تھوڑی بہت صداقت نظر آ جائے گی؛ تاہم یہاں ایک اہم غلطی ہو گئی ہے۔ محبت نہیں بلکہ خواہش ذہنی مرض ہے۔

اگر ''مبتلائے محبت'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں اور ہم پوری طرح ٹوٹ جائیں، دکھی ہو جائیں، محبت کے علاوہ کچھ سجھائی نہ دے، کوئی کام کرنے

کے قابل نہ رہیں، اور ہر چیز قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں، تو غالب امکان یہی ہے کہ یہ محبت نہیں ہے۔ قصے کہانیوں اور فلموں ڈراموں نے ہمیں جو کوئی سبق بھی پڑھایا ہو، سچی محبت ہمارا وہ حال نہیں کرتی جو منشیات اپنے عادی افراد کا کرتی ہیں۔

اور لہٰذا، ہم فلموں میں جو کچھ دیکھتے بڑے ہوئے ہیں، اس کے برعکس، اس طرح کا ہر چیز پر غالب آ جانے والا جنون محبت نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک اور نام ہے۔ اسے ''ہوا'' کہا جاتا ہے، یہ وہ لفظ ہے جو قرآن میں کسی فرد کی اسفل، خودغرضانہ خواہشات اور حرائص کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جو لوگ آنکھیں بند کر کے اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، اللہ نے انہیں سب سے زیادہ گمراہ قرار دیا ہے:

''پھر یہ اگر آپ کا کہا نہ مانیں تو جان لیجئے کہ یہ بس اپنی ہی خواہشوں (ہوا) کے پیچھے ہیں، اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑا ہو، اللہ کی رہنمائی کے بغیر۔'' (سورہ القصص: ۵۰)

اللہ کی رہنمائی کے بجائے اپنی ہوا کی غلامی کا فیصلہ کر کے، دراصل ہم ان خواہشات کی پرستش کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جب اپنی خواہش کی محبت، اللہ کی محبت پر غالب آ جائے، تو مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنا لیتے ہیں، ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے، اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں، کاش کہ مشرک لوگ جانتے جبکہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے، اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (تو ہرگز شرک نہ کرتے)۔ (سورہ البقرہ: ۱۶۵)

اگر کسی چیز کے لئے ہماری ''محبت'' ہمیں اپنے خاندان، اپنے وقار، اپنے خودداری، اپنے جسم، اپنے ہوش و حواس، اپنے ذہنی سکون، اپنے دن، اور حتیٰ کہ اپنے اس خدا کو بھی ترک کر دینے پر آمادہ کر دیتی ہے جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا، تو جان لیجئے کہ ہم ''مبتلائے محبت'' نہیں ہیں۔ ہم غلام ہیں۔

ایسے شخص کے لئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ اور اللہ نے باوصف علم کے اسے گمراہ کر دیا، اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی، اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔" (سورہ الجاثیہ:۲۳)

اس سختی کو محسوس کیجئے۔ نظر، سماعت اور دل پر مہر لگا دیا جانا۔ ہوا، لذت کا نام نہیں۔ یہ ایک قید خانہ ہے۔ یہ ذہن، جسم اور روح کی غلامی ہے۔ یہ ایک لت ہے اور ایک پرستش۔ ادب میں اس حقیقت کی خوبصورت مثالیں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناول "گریٹ ایکس پیک ٹیشنز" (Great Expectations) میں، پپ (Pip) اس نکتے کی تشریح کرتا ہے۔ اسٹیلا کے لئے اپنے جنون کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: "اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر یہ احساس میرے دل کو غم زدہ کر دیتا تھا کہ میں عقل و دانش کے برعکس، وعدے کے برعکس، ذہنی سکون کے برعکس، امید کے برعکس، مسرت کے برعکس، ہر ممکنہ حوصلہ شکنی کے برعکس اس سے محبت کرتا تھا۔"

ڈکنز کی مس ہیویشام (Miss Havisham) اسے مزید کھول کر بیان کرتی ہے: "میں تمہیں بتاتی ہوں...... کہ سچا پیار کیا ہے۔ یہ اندھی عقیدت ہے، بغیر اعتراض کئے خود کو ذلیل کرنا ہے، مکمل غلامی، اعتبار اور ایمان ہے اپنے خلاف اور پوری دنیا کے خلاف، دکھ دینے والے کو اپنا پورا دل اور روح سونپ دینا ہے...... جیسا کہ میں نے کیا۔"

جو مس ہیویشام یہاں بیان کر رہی ہے، وہ درحقیقت سچ ہے، لیکن یہ سچی محبت نہیں ہے۔ یہ ہوا ہے۔ سچی محبت، جیسا کہ اللہ کا مقصود تھا، کوئی مرض یا لت نہیں ہے۔ یہ الفت اور رحم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑے بنائے تا کہ ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت قائم کر دی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔" (سورہ الروم:۲۱)

سچی محبت سکون دیتی ہے، باطنی انتشار نہیں۔ سچی محبت آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اپنے حوالے سے بھی مطمئن ہوں اور خدا کے حوالے سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تاکہ تم آرام پاؤ۔'' ہوا اس کا الٹ ہے۔ ہوا آپ کو دُکھ دیتی ہے۔ اور کسی نشے کی طرح، آپ کو ہمیشہ اس کی طلب رہتی ہے، لیکن کبھی آپ کی تسلی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا نقصان کر کے اس کے پیچھے بھاگتے رہیں گے مگر کبھی اس تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور اگرچہ آپ اپنا پورا وجود اسے سونپ دیتے ہیں، لیکن اس کی بدولت کبھی آپ کو خوشی نصیب نہیں ہوگی۔

لہٰذا اگرچہ ہر کوئی سچی خوشی چاہتا ہے، لیکن اوہام کے پار دیکھنا اور محبت کو ہوا سے ممیز کرنا اکثر دشوار ہوتا ہے۔ بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ خود سے پوچھا جائے: کیا جس سے میں ''محبت'' کرتا ہوں، اس کے نزدیک آنے سے میں اللہ کے بھی نزدیک آؤں گا یا اس سے دور ہو جاؤں گا؟ کیا ایک اعتبار سے اس فرد نے میرے دل میں اللہ کی جگہ لے لی ہے؟

سچی یا خالص محبت کو کبھی محبت الٰہی کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے محبت الٰہی کو تقویت پہنچانی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سچی محبت ان حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل کی جاسکتی ہے جو کہ اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ان سے تجاوز کرنے کے بعد صرف ہوا باقی رہ جاتی ہے، جس کے ہم غلام بن سکتے ہیں یا چاہیں تو اسے مسترد بھی کر سکتے ہیں۔ ہم یا اللہ کے بندے ہوتے ہیں یا اپنی ہوا کے۔ ہم بیک وقت دونوں کی بندگی نہیں کر سکتے۔

جھوٹی لذتوں کے خلاف جدوجہد کر کے ہی ہم حقیقی لذت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ یہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات سے لڑنا، جنت کے حصول کی پیشگی شرط ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

> ''ہاں، جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا ہوگا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا ہوگا، تو اس کا ٹھکانا جنت ہی ہے۔''
>
> (سورہ النزِعٰت: ۴۱-۴۰)

ہواؤں میں محبت ہے

ہواؤں میں محبت ہے!

...... یا کم از کم فروری میں تشہیر باز آپ کو یہی باور کرانا چاہتے ہیں۔ اگر اپنی محبت کا کثرت سے اظہار کرنا اچھی بات ہے، مگر ویلنٹائنز ڈے سال میں ایک بار آتا ہے اور آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ محبت کا اظہار کریں یا لوگوں کی نگاہوں میں سنگدل قرار پائیں۔ پھولوں اور چاکلیٹ کے دکانداروں کے لئے عید فروری میں آتی ہے۔

تاہم ایسی ''کاروباری محبتوں'' کے درمیان بھی انسان ان کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے، چند نہایت اہم سوال لازماً ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔

اپنی ایک دوست کی کہی ہوئی بات پر غور کرتے ہوئے مجھے ان میں سے چند سوال یاد آئے۔ اس نے بیان کیا تھا کہ اپنے محبوب کی رفاقت میں اسے کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ میں، جب وہ ایک ساتھ ہوتے تھے تو پوری دنیا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کی بات پر جتنا غور کیا، مجھ پر اس کا اتنا ہی اثر ہوا، اور میں اتنا ہی زیادہ سوچنے پر مجبور ہوئی۔

بطور انسان، ہماری تخلیق ہی اس انداز میں ہوئی ہے کہ دوسروں کے حوالے سے محبت اور وابستگی محسوس کریں۔ یہ ہماری انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اگرچہ ہم کسی انسان کے بارے میں ایسے احساسات رکھ سکتے ہیں مگر دن میں پانچ مرتبہ اپنے خالق و مالک سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ کتنی بار ایسا ہوتا ہے کہ اپنے رب کی معیت میں ساری دنیا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ کیا ہم حقیقی معنوں میں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے لئے ہماری محبت دنیا کے ہر فرد اور ہر شے کی محبت سے بڑھ کر ہے؟

اکثر ہم سوچتے ہیں کہ اللہ محض تکالیف کے ذریعے ہماری آزمائش کرتا ہے، مگر یہ سچ نہیں ہے۔ اللہ آسانیوں کے ذریعے بھی ہماری آزمائش کرتا ہے۔ وہ نعمتوں کے ذریعے اور ہماری محبوب چیزوں کے ذریعے ہماری آزمائش کرتا ہے، اور ہم میں سے زیادہ تر اکثر انہی آزمائشوں میں ناکام ہوتے ہیں۔ ہماری ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ ہمیں یہ نعمتیں عطا کرتا ہے تو نادانستہ طور پر ہم انہیں جھوٹے معبود بنا لیتے ہیں۔

جب اللہ ہمیں مال و دولت دیتا ہے تو ہم اللہ کے بجائے دولت پر انحصار کرنے لگتے

ہیں۔ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارا رزق دولت کے سبب نہیں، اور نہ کبھی تھا، بلکہ رزاق کے سبب تھا۔ اچانک ہم کاروبار میں نقصان سے بچنے کیلئے شراب بیچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں یا احساسِ تحفظ حاصل کرنے کے لئے سودی قرضے لینے لگتے ہیں۔ ایسا کر کے ہم احمقانہ طور پر......اور ستم ظریفانہ طور پر......رزق کا تحفظ کرنے کے لئے رزاق کی نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔

جب اللہ ہمیں محبوب کی نعمت عطا کرتا ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ اس نعمت کا دینے والا اللہ ہے، اور ہم محبوب سے ویسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی کہ صرف اللہ سے کی جانی چاہئے۔ وہ فرد ہماری زندگی کا مرکز بن جاتا ہے...... ہمارے تمام تفکرات، خیالات، منصوبے، اندیشے، اور امیدیں اس کے گرد گھومنے لگتی ہیں۔ اگر محبوب کے ساتھ مناکحت کا رشتہ قائم نہیں ہوا تو اکثر اس کی قربت پانے کے لئے ہم حرامکاری پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ ہم سے جدا ہو جائیں تو ہماری پوری دنیا ڈھے جاتی ہے۔ لہٰذا اب، نعمت دینے والے کے بجائے ہم نے خود نعمت کو اپنا معبود بنالیا ہے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

"اور کچھ لوگ اللہ کے سوا اور معبود بنالیتے ہیں، ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے، اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔" (سورہ البقرہ: ۱۶۵)

اللہ کی نعمت پالینے کے بعد فراموشی میں مبتلا ہونے کی اس عادت کی بدولت اللہ تعالیٰ قرآن میں ہمیں انتباہ کرتا ہے:

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اس کی راہ کے جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے، اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

(سورہ التوبہ: ۲۴)

یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ مندرجہ بالا آیہ مبارکہ میں متذکر تمام چیزوں سے محبت کرنا حلال ہے، اور یہ اپنے طور پر نعمت ہیں اور نعمت کا سبب بھی۔ بلکہ ان نعمتوں میں سے چند اللہ کی نشانیوں میں شامل ہیں۔

ایک طرف اللہ فرماتا ہے:

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑے بنائے تاکہ ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت قائم کردی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔'' (سورہ الروم:۲۱)

مگر دوسری طرف، اللہ انتباہ کرتا ہے:

''اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور بعض بچے تمہارے دشمن ہیں پس ان سے ہوشیار رہنا۔'' (سورہ التغابن:۱۴)

اس آیہ مبارکہ میں کیا گیا انتباہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری بیویوں اور بچوں کا تذکرہ یہاں اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان نعمتوں میں شامل ہیں جن سے ہم سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور جس سے آپ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، آپ کی سب سے بڑی آزمائش بھی اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اس آزمائش میں کامیاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تہنیتی کارڈز اور گلابوں کے ایک طوفان کے پار منتظر، ایک عظیم تر محبت کو دیکھا جائے تو پھر ایسا ہی سہی۔ اور پھر کون سا وقت اور ہوگا جب یہ بات زیادہ برمحل ہوگی؟

کیونکہ آخرکار، ہواؤں میں محبت ہے۔

یہی محبت ہے

اور اس طرح چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پوری زندگی تلاش میں گزار دیتے ہیں۔ بعض اوقات دیتے ہوئے، بعض اوقات لیتے ہوئے۔ بعض اوقات تعاقب کرتے ہوئے لیکن اکثر محض انتظار کرتے ہوئے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ محبت ایک ایسا مقام ہے جہاں آپ پہنچتے ہیں: ایک طویل مسافت کے اختتام پر ایک منزل۔ اور وہ اس سفر کے اختتام اور منزل تک رسائی

کے بے صبری سے منتظر رہتے ہیں۔ یہ وہ دل ہوتے ہیں جو دلوں کی حرکت سے حرکت پاتے ہیں۔ وہ لاچار رومان پسند، رومانی کہانیوں یا حقیقی عقیدت کے کسی بھی مخلصانہ اظہار کے شیدائی۔ان کے لئے یہ تلاش پوری زندگی پر محیط ایک طرح کا جنون ہوتا ہے۔مگر اس المناک ''جستجو'' کی اپنی ایک قیمت ہوسکتی ہے، اور اپنے انعامات بھی۔

توقعات اور ''محبت کی محبت میں مبتلا ہونے'' کا راستہ پُرصعوبت ہے، مگر اس میں کئی اسباق مل سکتے ہیں۔ محبت، اس دنیا، لوگوں، اور خود اپنے دل کی فطرت کے بارے میں اسباق اس کٹھن راہ کو ہموار کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر، یہ سفر محبت کے خالق کے بارے میں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

اس راہ کے مسافر اکثر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس انسانی محبت کی انہیں تلاش رہی، وہ ان کی منزل نہیں تھی۔ اس انسانی محبت کی کوئی شکل ایک انعام ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے لیکن جب آپ اسے مقصد سمجھ لیں گے تو ناکامی آپ کا مقدر ٹھہرے گی۔ اور آپ کی پوری زندگی ایک غلط چیز پر فوکس کرنے میں گزر جائے گی۔ آپ وسیلے کی خاطر مقصد کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ دنیاوی کاملیت کی ایک ایسی ''منزل'' تک پہنچنے میں زندگی صرف کر دیں گے جو حقیقت میں وجود ہی نہیں رکھتی۔

اور جو سراب کے پیچھے بھاگتا ہے، کبھی اس تک پہنچ نہیں پاتا مگر بھاگتا رہتا ہے۔ اور اسی طرح آپ بھی بھاگتے رہیں گے، اپنی نیند قربان کرنے، آنسو بلکہ خون بہانے، اور اپنی ذات کے گرانقدر حصوں کی قربانی دینے پر آمادہ ہوں گے، بعض اوقات تو خود اپنی عزت و وقار کی بھی۔ اس زندگی میں آپ کو جس کی تلاش ہے، وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گا کیونکہ جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں وہ کوئی دنیاوی منزل نہیں ہے۔ جس طرح کی کاملیت کی آپ کو تلاش ہے، وہ اس مادی دنیا میں مل ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف خدا کی ذات میں مل سکتی ہے۔

انسانی محبت کی جس شبیہ کی آپ تلاش میں ہیں، وہ اس زندگی کے صحرا کا ایک واہمہ ہے۔ اس لئے اگر آپ کو اس کی تلاش ہے تو آپ ہمیشہ سرگرداں رہیں گے۔ مگر آپ سراب کے کتنا بھی نزدیک کیوں نہ پہنچ جائیں، آپ اسے چھو نہیں سکتے۔ کسی شبیہ پر تصرف حاصل کرنا

ممکن نہیں ہوتا۔ آپ اپنے ذہن کی تراشی ہوئی کسی تصویر کو اپنے ہاتھوں میں تھام نہیں سکتے۔

اس کے باوجود، اس ''مقام'' تک پہنچنے میں آپ اپنی پوری زندگی صرف کر دیں گے۔ آپ ایسا اس لئے کرتے ہیں کیونکہ پریوں کی کہانی میں، داستان یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا اختتام پا لینے، ملاپ ہونے اور پھر شادی پر ہوتا ہے۔ یہ دو روحوں کی یکجائی میں ملتی ہے۔ اور آپ کے اردگرد موجود ہر شخص آپ کو یہی سوچنے پر آمادہ کرے گا کہ سفر کا اختتام یہاں ہوتا ہے، اس مقام پر جہاں آپ اپنے محبوب سے، اپنے وجود کو مکمل کرنے والی ہستی سے ملتے ہیں...... سفر میں اس مقام پر جہاں آپ کی شادی ہو جاتی ہے۔ لوگ آپ کو بتاتے ہیں کہ صرف تب ہی آپ کی تکمیل ہوگی۔ یقیناً یہ بات غلط ہے کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی آپ کی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

لیکن بچپن سے جو سبق آپ کو دیا گیا ہے...... ہر کہانی میں، ہر نغمے میں، ہر فلم میں، ہر اشتہار میں، ہر ''خیر خواہ آنٹی'' کی طرف سے...... وہ یہ ہے کہ اس کے بغیر آپ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اور خدانخواستہ اگر آپ ان ''دھتکارے ہوؤں'' میں شامل ہیں جن کی کبھی شادی نہیں ہوتی، یا جنہیں طلاق ہو جاتی ہے، تو پھر آپ کو کسی طرح سے عیب دار یا نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

جو سبق آپ کو پڑھایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کہانی شادی پر ختم ہو جاتی ہے، اور یہاں سے جنت کی شروعات ہوتی ہے۔ تب آپ کی نجات ہوگی اور تکمیل ہوگی، اور ہر ٹوٹی ہوئی چیز پھر سے جڑ جائے گی۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ یہاں سے تو اس کا آغاز ہوتا ہے۔ تعمیر کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے: زندگی کی تعمیر، آپ کے کردار کی تعمیر، صبر و تحمل، ثابت قدمی اور ایثار کی تعمیر۔ بے غرضی کی تعمیر۔ محبت کی تعمیر۔

اور اللہ کی طرف واپسی کے راستے کی تعمیر۔

لیکن اگر جس سے آپ کی شادی ہوئی ہے، وہی آپ کی زندگی کا مرکز و محور بن جائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی جدوجہد کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ اب آپ کا جیون ساتھی آپ کی سب سے بڑی آزمائش بن جائے گا۔ جب تک آپ اس فرد کو اپنے دل میں اس مقام سے نہیں ہٹائیں گے، جس پر کہ صرف اللہ کو ہونا چاہیئے، آپ کو تکلیف پہنچتی رہے گی۔ ستم ظریفی کی بات

یہ ہے کہ آپ کا جیون ساتھی استخراج کے اس تکلیف دہ عمل کا آلہ بنا رہے گا تاوقتیکہ آپ یہ نہ جان لیں کہ انسانی دل میں بعض مقام ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف اللہ تشکیل دیتا ہے، اور جو صرف اللہ کے لئے ہوتے ہیں۔

سود و زیاں، کامیابی و ناکامی اور بہت سی غلطیوں سے پُر ایک سفر کے بعد، اس راہ پر جو اسباق آپ کو ملیں گے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ محبت کی کم از کم دو اقسام ہوتی ہیں۔ بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن سے آپ اس چیز کی بدولت محبت کرتے ہیں جو آپ کو ان سے ملتی ہے: جو وہ آپ کو دیتے ہیں، جن احساسات سے وہ آپ کو ہمکنار کرتے ہیں۔ غالباً محبت کا زیادہ تر حصہ اسی قسم پر مشتمل ہوتا ہے...... اور اسی وجہ سے محبت اتنی غیر مستحکم ہوتی ہے۔ ایک انسان کی دینے کی صلاحیت بے ثبات اور تغیر پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ ایک احساس کے تعاقب میں ہیں تو آپ کا تعاقب ہمیشہ جاری رہے گا۔ کوئی احساس ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ کی محبت کا دارومدار اس پر ہوگا تو یہ بھی بے ثبات اور تغیر پذیر ہو جائے گی۔ اور اس دنیا کی ہر چیز کی طرح، آپ جتنا اس کے پیچھے بھاگیں گے، یہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگے گی۔

لیکن کبھی کبھار ایسے لوگ آپ کی زندگی میں آتے ہیں جن سے آپ اس لئے محبت نہیں کرتے کہ وہ آپ کو کیا دیتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ خود کیا ہیں۔ آپ کو ان میں جو حسن نظر آتا ہے، وہ خالق کا ایک عکس ہے، اس لئے آپ ان سے محبت کرتے ہیں۔ اب اچانک بات یہ نہیں رہتی کہ آپ کو کیا مل رہا ہے، بلکہ یہ ہو جاتی ہے کہ آپ کیا دے سکتے ہیں۔ یہ بے لوث محبت ہے۔ محبت کی یہ دوسری قسم بہت کمیاب ہے۔ اور اگر اس کی اساس اللہ کی محبت پر رکھی گئی ہے، اور یہ اللہ کی محبت میں شریک نہیں، تو اس کی بدولت آپ کو بے پایاں مسرتیں حاصل ہوں گی۔ کسی بھی اور طرح کی محبت کا مطلب ہے کسی چیز کی ضرورت محسوس کرنا، کسی چیز پر منحصر ہونا، توقعات پالنا...... ہمارے دکھوں اور مایوسیوں کی تعمیر انہی اجزا سے ہوتی ہے۔

لہٰذا وہ سب جنہوں نے اپنی زندگی تلاش میں گزاری ہے، جان لیں کہ ہر چیز کی خالص ترین شکل، اس کے مخرج، اس کے سرچشمے سے ملتی ہے۔ اگر آپ کو محبت کی تلاش ہے تو اسے اللہ کے ذریعے ڈھونڈئیے۔ باقی سارے ذریعے، سارے وسیلے، جن کی اساس اللہ کی ذات پر نہیں

رکھی گئی، زہر کے مترادف ہیں۔ جوان سے اکتساب کرتا ہے، زہر اس کی رگوں میں اتر جاتا ہے، اور بالآخر اسے ہلاکت کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔ ان سے اکتساب کرنے والا اندر ہی اندر مر رہتا ہے تاوقتیکہ وہ ان سے اکتساب کرنا چھوڑ ے اور پانی کا خالص و پاکیزہ سرچشمہ ڈھونڈ لے۔

جب آپ کو یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ہر چیز کا حسن محض خدا کے حسن کا عکس ہے تو پھر صحیح طریقے سے محبت کا سبق حاصل کریں گے: یعنی اللہ کی ذات کے لئے محبت۔ آپ جس کسی سے بھی محبت کریں گے، اللہ کے لئے کریں گے، اللہ کے ذریعے کریں گے اور اللہ کی وجہ سے کریں گے۔ ایسی محبت کی اساس اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ لہٰذا جس کا دامن آپ تھامیں گے، وہ محض ایک بے ثبات، ختم ہو جانے والا احساس نہیں ہوگا۔ اور آپ کی بھاگ دوڑ محض ایک عارضی سرخوشی نہیں ہوگی۔ جس کا دامن آپ تھامیں گے، جس کے لئے آپ بھاگ دوڑ کریں گے، جس سے آپ محبت کریں گے، وہ اللہ کی ذات ہوگی: واحد ذات جو مستقل اور باقی رہنے والی ہے۔ اس کے بعد سے ہر چیز اللہ کے ذریعے سے ہوگی۔ آپ جو بھی دیں گے یا لیں گے، جس سے محبت کریں گے یا نہیں کریں گے، نفس کے ذریعے سے نہیں بلکہ سب اللہ کے ذریعے ہوگا۔ آپ کے نفس کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے لئے ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس چیز سے محبت کریں گے جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور جس سے وہ محبت نہیں کرتا، اس سے محبت نہیں کریں گے۔ اور جب آپ محبت کریں گے تو آپ مخلوق کو دیں گے...... یہ سوچ کر نہیں کہ اس کے بدلے میں آپ کو کیا مل سکتا ہے۔ آپ محبت کریں گے اور آپ دیں گے لیکن آپ کی کفایت اللہ کرے گا۔ اور جس کی کفایت اللہ کرتا ہے، وہ محبت کرنے والوں میں سب سے زیادہ دولتمند اور سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے۔ آپ کی محبت اللہ کے ذریعے ہوگی، اللہ کے لئے ہوگی، اور اللہ کی وجہ سے ہوگی۔ یہ کسی بھی مخلوق سے اپنی ذات کو آزاد کرالینا ہے۔ اور یہی آزادی ہے۔ یہی خوشی ہے۔

یہی محبت ہے۔

اصلی چیز سے محبت کیجئے

کسی چیز کو چھوڑ دینا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے؟ ہم میں سے زیادہ تر اس بات پر

متفق ہوں گے کہ بہت کم کام ایسے ہیں جو اپنی کسی محبوب چیز کو چھوڑ دینے سے زیادہ مشکل ہوں۔ اوراس کے باوجود، بعض اوقات ہمیں ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ہم ایسی چیزوں سے محبت کرتے ہیں جنہیں ہم پا نہیں سکتے۔ بعض اوقات ہمیں ایسی چیزوں کی چاہت ہوتی ہے جو ہمارے لئے اچھی نہیں ہوتیں۔ اور بعض اوقات ہم کسی ایسی چیز کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے اللہ کو محبت نہیں ہوتی۔ ایسی چیزوں کو چھوڑنا دشوار ہوتا ہے۔ جس چیز پر دل آ جائے، اسے چھوڑ دینا ہماری زندگی کی مشکل ترین جنگوں میں سے ایک ہوتا ہے۔

لیکن اگر یہ کام ایسی جنگ نہ رہے تو کیسا ہو؟ اگر یہ کام اتنا مشکل نہ رہے تو کیسا ہو؟ کیا کسی وابستگی کو ختم کرنے کا کوئی آسان طریقہ بھی موجود ہے؟ جی ہاں۔ موجود ہے۔

اس سے بہتر کوئی چیز ڈھونڈ لی جائے۔

کہتے ہیں کہ کسی کی یاد تب تک دل سے نہیں جاتی جب تک اس سے بہتر کوئی شخص یا کوئی چیز ہمیں نہیں مل جاتی۔ بطور انسان، خالی پن کو برداشت کرنا ہمارے لئے مشکل ہوتا ہے۔ خالی جگہ کو بھرنا اور فوراً بھرنا ہمارے لئے ضروری ہوتا ہے۔ خالی پن کی تکلیف بہت شدید ہوتی ہے۔ تکلیف کا شکار اس خلا کو پُر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خلا کے ساتھ گزرنے والا ایک ایک لمحہ شدید کرب کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے ہم توجہ بھٹکانے والی ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف، ایک وابستگی سے دوسری وابستگی کی طرف بھاگتے رہتے ہیں۔

دل کو آزاد کرانے کی جستجو میں، ہم اپنے جھوٹے آسروں سے جان چھڑانے کے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں۔ مگر پھر وہی سوال آ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے: یہ کام کیسے کیا جائے؟ ایک دفعہ کوئی جھوٹی وابستگی جڑ پکڑ لے تو اسے کیسے ختم کیا جائے؟ اکثر یہ کام بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں چیزوں کی لت پڑ جاتی ہے، اور ہم ان سے خلاصی حاصل نہیں کر پاتے۔ تب بھی جب ان کی وجہ سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔ تب بھی جب ان کی وجہ سے ہماری زندگی اور خدا کے ساتھ ہمارا تعلق مجروح ہو جاتا ہے۔ تب بھی جب وہ ہمارے لئے اتنی مضر ثابت ہو رہی ہوتی ہیں۔ ہم ان سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ ہم ان پر بہت زیادہ تکیہ کرتے ہیں۔ ہم ان سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور وہ بھی غلط انداز میں۔ وہ ہمیں کوئی ایسی چیز فراہم کرتی ہیں

جس کی، ہمارے خیال میں، ہمیں ضرورت ہوتی ہے...... جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور لہٰذا، انہیں چھوڑنے کی کوشش کرنے میں ہمیں اس قدر دشواری کا سامنا ہوتا ہے کہ ہم کوشش چھوڑ دیتے ہیں، انہیں نہیں چھوڑتے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ کی پسندیدہ چیز کے لئے قربان کر دینے میں ہمیں اتنی مشکل کیوں پیش آتی ہے؟ آخر ہم سیدھے سبھاؤ چیزوں کو چھوڑ کیوں نہیں سکتے؟ میرے خیال میں ہمیں اپنی پسندیدہ چیزوں کو چھوڑنے میں اتنی مشکل اس لئے پیش آتی ہے کیونکہ ان کی جگہ رکھنے کیلئے ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہوتی جو ہمیں ان سے بھی زیادہ پسند ہو۔

جب بچہ کسی کھلونا گاڑی کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ محبت اس پر پوری طرح سے غالب آ جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ گاڑی اسے نہ مل سکے تو کیا ہو؟ اگر ہر روز اسے سٹور کے پاس سے گزرنا پڑے اور وہ کھلونا دیکھنا پڑے جسے وہ حاصل نہیں کر سکتا تو کیا ہو؟ جتنی بار وہ سٹور کے پاس سے گزرے گا، تکلیف محسوس کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ وہ خود کو اسے چرانے سے بڑی مشکل سے باز رکھے۔ لیکن اگر وہ بچے سٹور سے پرے دیکھے اور اسے ایک اصلی گاڑی نظر آ جائے تو کیا ہو؟ اگر اسے اصلی فیراری نظر آ جائے تو کیا ہو؟ کیا اب بھی اسے کھلونے کی ویسی ہی خواہش باقی رہے گی؟ کیا اب اسے چرانے کی خواہش پر قابو پانا پڑے گا؟ یا وہ اس قابل ہو جائے گا کہ نظریں اٹھائے بغیر کھلونے کے پاس سے گزر جائے...... اصل اور نقل کا فرق اس کی مشکل کو ختم کر دے گا؟

ہم محبت چاہتے ہیں۔ ہم دولت چاہتے ہیں۔ ہم مقام و مرتبہ چاہتے ہیں۔ ہم یہ زندگی چاہتے ہیں۔ اور اس بچے کی طرح، ہم پر بھی یہ محبتیں پوری طرح غالب آ جاتی ہیں۔ لہٰذا جب ہمیں یہ چیزیں نہیں مل پاتیں تو ہم سٹور میں کھڑے اس بچے کی طرح انہیں چرا لینے کی خواہش پر قابو پاتے رہ جاتے ہیں۔ ہم اپنی محبت کی خاطر حرام کام کا مرتکب ہونے کی خواہش سے لڑ رہے ہیں۔ ہم حرام تعلقات، حرام کاروباری سودوں، حرام افعال، حرام لباس کو چھوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس زندگی کی محبت کو ترک کر دینے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ ہم لڑکھڑاتے ہوئے بندے، کھلونے کو ترک کر دینے کی کوشش کر رہے ہیں...... کیونکہ اس کے علاوہ ہمیں اور

کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ پوری زندگی اور اس میں موجود ہر چیز اس کھلونا گاڑی کی طرح ہے۔ ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ ہمیں اس سے بڑی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ ہمیں اصلی چیز نظر نہیں آتی۔ اصل شکل، اصل نمونہ دکھائی نہیں دیتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور دنیا کی یہ زندگانی تو محض کھیل تماشا ہے، البتہ آخرت کے گھر کی زندگی حقیقی زندگی ہے، کاش یہ جانتے ہوتے۔'' (سورہ العنکبوت:۶۴)

اس دنیا کے بارے میں بات کرتے ہوئے اللہ عربی لفظ ''حیات'' استعمال کرتا ہے، لیکن اگلی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ بڑا مفہوم پیش کرنے والا لفظ ''الحیوان'' استعمال کرتا ہے۔ اگلی زندگی حقیقی زندگی ہے۔ حقیقت سے بڑھ کر زندگی ہے۔ حقیقی شکل ہے۔ اور پھر اللہ ان الفاظ کے ساتھ آیت کا اختتام کرتا ہے: ''کاش یہ جانتے ہوتے۔'' اگر ہم اصلی چیز کو دیکھ سکیں، تو کمتر اور نقلی نمونے کے لئے اپنی محبت پر قابو پانا آسان ہو جائے۔

ایک اور آیہ مبارکہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

''لیکن تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ اور آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔'' (سورہ الاعلیٰ: ۱۷-۱۶)

اصلی شکل معیار میں بھی بہتر (خَیْرٌ) ہے اور مقدار میں بھی (اَبْقٰی)۔ اس دنیا میں ہماری پسندیدہ چیز کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو، معیار اور مقدار کے حوالے سے اس میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوگا۔

اس بات کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دنیاوی اسباب حاصل نہیں کر سکتے یا یہ کہ اسے عزیز نہیں رکھ سکتے۔ بطور مومنین، ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ دنیاوی و اخروی، ہر دو طرح کی زندگیوں میں خیر کے طلب گار رہوں۔ مگر بات وہی کھلونا گاڑی اور اصلی گاڑی کی ہے۔ ہم کھلونا کار حاصل کر سکتے ہیں اور اسے لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہم ان کے مابین فرق سے واقف ہوتے ہیں۔ ہمیں بخوبی علم ہوتا ہے کہ ایک طرف کمتر ماڈل (دنیا: عربی کے لفظ ''دَنیہ'' سے مشتق، جس کے

معنی ہی ''پست'' کے ہوتے ہیں) ہے، اور دوسری طرف حقیقی ماڈل (حیاتِ اخروی)۔

لیکن یہ تفہیم اس زندگی میں ہمارے لئے کس طرح مددگار ثابت ہوتی ہے؟ یہ اس اعتبار سے مددگار ثابت ہوتی ہے کہ یہ حلال راہ پر چلنے، اور حرام سے بچنے کی ''جدوجہد'' کو زیادہ آسان کر دیتی ہے۔ اصلی چیز کے حوالے سے ہمارا شعور جتنا زیادہ ہوگا، ضرورت پڑنے پر ''نقلی چیز'' کو چھوڑ دینا ہمارے لئے اتنا ہی آسان ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں ''نقلی چیز'' کو پوری طرح سے یا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا ہے۔ اس کے بجائے یہ کمتر ماڈل (یعنی دنیا) کے ساتھ ہمارے تعلق کو ایسا بنا دیتی ہے کہ اگر اور جب ہمیں ''اصلی چیز'' کے لئے کسی شے کو چھوڑنے کا کہا جائے تو ہمیں ایسا کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ اگر ہمیں کسی ایسی حرام چیز سے باز رہنے کو کہا جائے جس کی ہمیں خواہش ہو، تو باز رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں کسی ایسے حکم کی تعمیل کرنے کو کہا جائے جو ہمیں مشکل محسوس ہوتا ہو، تو عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم ایک سمجھدار بچے کی طرح بن جاتے ہیں جسے کھلونے کی خواہش تو ہے لیکن اگر ہم اس سے کہیں کہ وہ کھلونے اور اصلی چیز میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے تو اسے صحیح فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ مثال کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی اصحابؓ کے پاس دولت تھی، لیکن جب وقت آتا تو وہ اللہ کی راہ میں بڑی آسانی سے اپنی آدھی یا پوری دولت قربان کر دیتے۔

یہ فوکس اس امر کی نوعیت بھی بدل دیتا ہے کہ ہم کس کے سامنے درخواست گزار ہوں گے یا کس کی پسندیدگی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہمیں کسی چیز کی اشد ضرورت ہو تو ہم بندے سے صرف اسی صورت میں درخواست کریں گے جب ہمیں بادشاہ نظر نہ آتا ہو یا ہم بادشاہ کے وجود سے واقف ہی نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم بادشاہ سے ملاقات کے لئے جا رہے ہوں اور راستے میں ہماری ملاقات اس کے بندے سے ہو جائے تو ہم اس سے علیک سلیک کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کر سکتے ہیں، اس سے محبت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب بادشاہ کو متاثر کرنا ہو تو ہم اس کے بندے کو متاثر کرنے پر اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ جب سارا کنٹرول بادشاہ کے ہاتھ میں ہوگا تو ہم اپنی ضرورت کے لئے کبھی بندے کے سامنے

خواستگار ہونے پر اپنی محنت برباد نہیں کریں گے۔ بادشاہ نے اپنے بندے کو کچھ اختیار دے رکھا ہو تو بھی، ہمیں اچھی طرح سے علم ہو گا دینے اور لینے کا حتمی اختیار صرف اور صرف بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علم صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ہم بادشاہ کو جان لیں، بادشاہ کو دیکھ لیں۔ اور یہ علم بندے کے ساتھ ہمارے میل ملاپ کی نوعیت کو یکسر بدل دیتا ہے۔

اصلی چیز کو دیکھ لیا جائے تو ہماری محبتوں کا انداز بدل جاتا ہے۔ ابن تیمیہؒ نے اس تصور پر ان الفاظ میں گفتگو کی ہے:

''اگر آپ کا دل کسی ایسی ہستی کی غلامی میں گرفتار ہو گیا ہے جو اس پر حرام کر دی گئی ہے تو اس تکلیف دہ صورتِ حال کے ظہور پذیر ہونے کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اللہ کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے، کیونکہ ایک دفعہ دل اللہ کی عبادت اور اس کے حوالے سے اخلاص کا ذائقہ چکھ لے تو اس کے مقابلے میں کسی اور چیز کا ذائقہ اسے نہیں بھائے گا، کوئی چیز اسے اس سے زیادہ خوشی نہیں دے گی اور کوئی اور چیز اس کے لئے اس سے زیادہ عزیز نہیں ہوگی۔ کوئی شخص اپنے محبوب کو نہیں چھوڑتا ماسوائے اس صورت کے کہ وہ کسی اور سے زیادہ محبت کرنے لگے یا اسے کسی اور چیز کا خوف لاحق ہو جائے۔ دل ناقص محبت کو چھوڑ دیتا ہے، حقیقی محبت کے لئے یا نقصان پہنچنے کے خوف سے۔''

بہ حیثیت امت، ہمارے سب سے بڑے مسائل میں سے ایک کی نشاندہی ایک حدیث نبویﷺ میں کی گئی ہے: ''الوھن''، یعنی دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔ ہم دنیا کی محبت میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور جب بھی آپ محبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس محبت پر قابو پانا یا اس سے الگ ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے تاوقتیکہ آپ اس سے بہتر کسی چیز کی محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ دنیا کی اس تباہ کن محبت کو اپنے دلوں سے نکالنا تقریباً ناممکن ہے تاوقتیکہ اس کی جگہ لینے کے لئے ہمیں کوئی بہتر چیز مل جائے۔ کسی سے زیادہ شدید محبت ہو جائے تو پرانی محبتوں کو دل

سے نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب اللہ کی محبت، اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور اللہ کے ہاں اپنے گھر کو حقیقی معنوں میں دیکھ لیا جائے، تو یہ کسی بھی اور محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ اس محبت کا مشاہدہ جتنا زیادہ ہوگا، اس کے غلبے میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ اور یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو حقیقت کا روپ دینا اتنا ہی آسان ہو جائے گا:

> ''آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔'' (سورہ الانعام:۱۶۲)

لہٰذا علیحدگی کا راستہ محبت میں پوشیدہ ہے۔ محبت کیجئے۔ عظیم تر ہستی سے محبت کیجئے۔ ''اصلی چیز'' سے محبت کیجئے۔ محل کو دیکھئے۔

اس کے بعد ہی ہم گڑیا گھر میں کھیلنے سے رک سکیں گے۔

ایک کامیاب شادی: گمشدہ کڑی

> نوٹ: یہ مضمون اس مفروضے کے تحت لکھا گیا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان باہمی احترام کی ایک کم از کم سطح موجود ہوگی۔ احترام کے تصور کا کسی صورت یہ مطلب نہیں کہ جسمانی، جذباتی یا نفسیاتی بدسلوکی سے درگزر کیا جائے۔ اپنے یا اپنے گھر والوں کے ساتھ بدسلوکی کو قبول کر لینا صبر نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔ اور ہمیں بھی نہیں کرنا چاہیے۔

> ''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑے بنائے تاکہ ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت قائم کر دی، یقیناً غور وفکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔'' (سورہ الروم:۲۱)

ہم سب نے شادیوں کے بے شمار دعوت ناموں پر یہ آیۂ مبارکہ پڑھی ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے اسے حقیقی شکل دے سکے؟ کتنی شادیاں ایسی ہیں جن میں اللہ کی بیان کردہ محبت اور رحمت کی تجسیم نظر آتی ہے؟ جب اتنی بہت سی شادیوں کا اختتام طلاق پر ہو رہا ہے تو غلطی کہاں

پر ہو رہی ہے؟

''محبت اور احترام: جس محبت کی خاتون کو سب سے زیادہ خواہش ہوتی ہے، جس احترام کی مرد کو سب سے اشد ضرورت ہوتی ہے'' نامی کتاب کے مصنف ڈاکٹر ایمرسن ایگرکس (Emerson Eggerichs) کے مطابق، اس کا جواب سادہ سا ہے۔ اپنی کتاب میں، ایگرکس وضاحت کرتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر کی جانے والی تحقیقات سے دریافت ہوا ہے کہ مرد کی بنیادی ضرورت احترام کی ہوتی ہے، جبکہ عورت کی بنیادی ضرورت محبت کی ہوتی ہے۔ وہ ایک عمل کو بیان کرتے ہیں جسے انہوں نے ''مجنونانہ چکر'' (crazy cycle) کا نام دیا ہے: یہ عمل بحث و تکرار کے ایک پیٹرن پر مشتمل ہے جو اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب بیوی احترام کا مظاہرہ نہیں کرتی اور شوہر محبت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ کیسے یہ دونوں افعال ایک دوسرے کو تقویت بھی پہنچاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پیدا کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، جب بیوی کو لگتا ہے کہ شوہر محبت کا مظاہرہ نہیں کر رہا، تو ردِ عمل میں وہ اکثر بدتمیزی کا مظاہرہ کرتی ہے، جس کے نتیجے میں شوہر کی بے التفاتی میں اور بھی شدت آ جاتی ہے۔

ایگرکس کا کہنا ہے کہ اس ''مجنونانہ چکر'' سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے لئے غیر مشروط طور پر احترام کا مظاہرہ کرے اور شوہر اپنی بیوی کو غیر مشروط محبت دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ پہلے شوہر اپنے رویئے میں محبت پیدا کرے، اس کے بعد وہ احترام کا مظاہرہ کرے گی۔ ایسا کرنے کے نتیجے میں شوہر کی بے التفاتی میں محض اضافہ ہی ہوگا۔ اور شوہر کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ پہلے بیوی احترام کا مظاہرہ کرے، پھر وہ محبت کا مظاہرہ کرے گا۔ ایسا کر کے وہ بیوی کے بدتمیزانہ رویئے میں مزید شدت ہی پیدا کرے گا۔ دونوں کو غیر مشروط طور پر چلنا چاہئے۔

اس نظریئے پر غور کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اگر قرآنی اور نبویؐ دانش کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ازدواجی تعلق کے حوالے سے یہی دو باتیں جن پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مردوں کو تلقین کی:

''عورتوں کا اچھی طرح سے خیال رکھو، کیونکہ انہیں ایک ٹیڑھی پسلی سے تخلیق کیا گیا تھا، اور اس کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی حصہ ہے۔ تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو ٹیڑھی ہی رہے گی، اس لئے عورتوں کا اچھی طرح سے خیال رکھو۔'' (بخاری و مسلم)

آپ ﷺ نے مزید زور دیتے ہوئے کہا:

''سب سے بہتر مومن وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے، اور تم میں سے سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے سب سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔'' (جامع ترمذی)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

''ایک مومن کو ایک مومنہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر وہ اس کی کسی عادت کو ناپسند کرتا ہے تو کسی دوسری عادت سے خوش بھی ہوگا۔'' (صحیح مسلم)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، گو تم انہیں ناپسند کرو لیکن بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا جانو، اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائی کر دے۔

(سورہ النساء:۱۹)

دانش و حکمت کے ان موتیوں کے ذریعے مردوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ مہربانی اور محبت کا برتاؤ کریں۔ مزید برآں انہیں یہ بھی ترغیب دی گئی ہے کہ جب وہ محبت اور مہربانی کا اظہار کر رہے ہوں تو اپنی بیوی کی خامیوں کو درگزر کریں۔

دوسری طرف بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے فوکس بدل دیا گیا ہے۔ عورتوں سے بار بار یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ محبت اور مہربانی پر مبنی رویہ اختیار کریں؟ شاید اس کی وجہ ہے کہ غیر مشروط محبت پہلے ہی عورت کی فطرت میں ہوتی ہے۔ بہت کم مرد یہ شکایت

کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ ان کی بیویاں ان سے محبت نہیں کرتیں۔ لیکن یہ شکایت بہت سے مرد کرتے ہیں کہ ان کی بیویاں ان کی عزت نہیں کرتیں۔ اور بیویوں کے حوالے سے قرآن وسنت میں اسی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

عزت واحترام کا اظہار کئی طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ احترام کا اظہار کرنے کے اہم ترین طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کی خواہشات کا احترام کیا جائے۔ جب کوئی کہے: ''میں آپ کے مشورے کا احترام کرتا ہوں۔'' تو اس کا مطلب ہوتا ہے: ''میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔'' کسی لیڈر کا احترام کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ اپنے والدین کا احترام کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور اپنے شوہر کا احترام کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی خواہشات کا احترام کیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

> ''جب کوئی عورت پنج وقتہ نمازیں ادا کرتی ہے، روزے رکھتی ہے، اپنے جسم کی حفاظت کرتی ہے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے: ''جنت کے جس دروازے سے چاہو، اندر داخل ہو جاؤ۔'' (جامع ترمذی)

بہ حیثیت عورت، ہم سے یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اپنے شوہروں کی خواہشات کا احترام کریں اور ان کے مطابق چلیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کے سر پر مقابلتاً زیادہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

> ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں......''
>
> (سورہ النساء: ۳۴)

لیکن اپنے شوہر کے لئے ایسے غیر مشروط احترام کا مطلب یہ نہیں کہ بطور عورت ہماری حیثیت کمزور اور غلامانہ ہو جائے گی؟ کیا اس کے نتیجے میں ہمارا استحصال نہیں ہوگا اور ہمیں بدسلوکی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا؟ حقیقت اس کے یکسر برعکس ہے۔ قرآن کریم، نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت، اور جدید تحقیق نے بھی حقیقت کو اس کے بالکل الٹ ثابت کیا ہے۔
ایک عورت اپنے شوہر کے لئے جس قدر زیادہ عزت و احترام کا مظاہرہ کرے گی، وہ اس کے لئے اتنی ہی زیادہ محبت اور مہربانی کا مظاہرہ کرے گا۔ اور اس کے برعکس، وہ اس کے ساتھ جس قدر بدتمیزی کا مظاہرہ کرے گی، شوہر کے رویئے میں اسی قدر سختی اور بے مہری پیدا ہوگی۔

اسی طرح ایک مرد بھی سوال کرتا ہے کہ اسے اپنی بدتمیز بیوی کے لئے بھی محبت اور مہربانی پر مبنی رویہ کیوں اپنانا چاہئے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے صرف حضرت عمر ابن الخطابؓ کی مثال ملاحظہ کر لینا ہی کافی ہے۔ جب ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس (جو اس وقت خلیفہ المسلمین تھے) اپنی بیوی کی شکایت کرنے کے لئے آیا، تو اس نے حضرت عمرؓ کی اپنی بیوی کو ان پر چلاتے ہوئے سنا۔ وہ آدمی جانے کے لئے مڑا تو حضرت عمرؓ نے اسے آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اس آدمی نے بتایا کہ وہ اسی مسئلے کی شکایت لے کر آیا تھا جو حضرت عمرؓ کو خود درپیش تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ان کی بیوی انہیں برداشت کرتی ہے، ان کے کپڑے دھوتی ہے، ان کے گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہے، ان کے لئے آرام و سہولت کے اسباب مہیا کرتی ہے، اور ان کے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ اگر وہ ان کے لئے یہ سب کر سکتی ہے تو کیا وہ اس وقت صبر و برداشت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے جب اس کی آواز بلند ہو جاتی ہے؟

یہ کہانی ہم سب کے لئے ایک خوبصورت مثال فراہم کرتی ہے...... صرف مردوں کے لئے نہیں۔ یہ کہانی اس صبر و تحمل کی ایک انمول نظیر ہے جو کہ کسی بھی شادی کو کامیاب بنانے کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مزید برآں، اس جزا کو بھی مدنظر رکھئے جو صابرین کو روزِ آخر ملنے والی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''......صبر کرنے والے ہی کو ان کا پورا پورا بے شمار اجر دیا جاتا ہے۔''

(سورہ الزمر: ۱۰)

☆☆☆

مشکلات

طوفان میں واحد جائے پناہ

طوفان آیا ہو تو قدم جما کے کھڑے ہونا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ بارش شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد بجلی چمکنا شروع ہو جاتی ہے۔ گھنے سیاہ بادل سورج کو ڈھانپ لیتے ہیں اور چاروں طرف اس سمندر کی متلاطم موجوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا جو تھوڑی دیر پہلے پُرسکون تھا۔ اپنے طور پر آگے بڑھنے سے خود کو لاچار پا کر آپ امداد و اعانت کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔

سب سے پہلے آپ کوسٹ گارڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب دوبارہ سے کشتی کو سیدھی راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ لائف بوٹ تلاش کرتے ہیں۔ یہ غائب ہو چکی ہے۔ آپ لائف جیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یہ پھٹی ہوئی ملتی ہے۔ ہر دنیاوی وسیلہ آزما لینے کے بعد آخر کار آپ آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں۔

اور اپنے رب سے خواستگار ہوتے ہیں۔

تاہم اس لمحے میں کوئی خاص بات ہے۔ اس پل آپ کو ایک ایسی چیز کا تجربہ ہوتا ہے جس کے بارے میں آپ بصورتِ دیگر صرف سوچ ہی کر سکتے ہیں: حقیقی توحید۔ وحدانیت۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ساحل پر کھڑے ہو کر آپ نے خدا سے دعا کی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے بہت سے دوسروں کے سامنے بھی عرضیاں گزاریں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے خدا پر انحصار کیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ دیگر بہت سے آسروں کو بھی پکڑے رکھا۔ لیکن اس خاص لمحے میں باقی سب دروازے بند ہو گئے۔ کوئی راہ باقی نہ رہی۔ کوئی آسرا باقی نہ بچا۔ کوئی فریاد سننے والا نہ رہا۔ سوائے ہمارے رب کے۔

اور یہی نکتے کی بات ہے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ جب آپ کی ضرورت سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے،

تب مخلوق کا ہر دروازہ بند کیوں ملتا ہے؟ آپ ایک دروازے پر دستک دیتے ہیں مگر اسے دھڑام سے بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ دوسرے دروازے پر جاتے ہیں۔ یہ بھی بند ملتا ہے۔ آپ در بدر بھٹکتے ہیں، دستک دیتے ہیں، دھڑ دھڑاتے ہیں، لیکن کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ اور جن دروازوں پر ایک وقت میں آپ تکیہ کرتے رہے ہیں، وہ بھی اچانک بند ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم انسانوں میں چند مخصوص اوصاف پائے جاتے ہیں جن کا ہمارے رب کو بخوبی علم ہے۔ ہمیں ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کی ضرورت رہتی ہے۔ ہم کمزور ہیں، مگر ہم عجلت پسند اور بے صبرے بھی ہیں۔ جب ہم مصیبت میں ہوتے ہیں تو سہارا تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ہمارے رب کی منشا ہے۔ اگر موسم خوشگوار ہو اور دھوپ نکلی ہوئی ہو تو ہم جائے پناہ کیوں تلاش کریں گے؟ انسان جائے پناہ کب تلاش کرتا ہے؟ اس وقت جب طوفان آتا ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ طوفان بھیجتا ہے، وہ ایک صورتِ حال تخلیق کرتا ہے جس کے تحت ضرورت پیدا ہوتی ہے، تا کہ ہم جائے پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہوں۔

لیکن جب ہم جائے پناہ تلاش کرتے بھی ہیں تو اپنی بے صبری کی بدولت، ہم وہ راہ تلاش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہو اور جو ہمیں آسان نظر آتی ہو۔ ہم اسے ان چیزوں میں تلاش کرتے ہیں جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں اور چھو سکتے ہیں۔ ہم شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ ہم مخلوق سے اعانت مانگتے ہیں، بشمول خود اپنی ذات کے۔ ہم وہاں سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں جو ہمیں نزدیک ترین لگتا ہے۔ اور کیا یہی دنیاوی زندگی کی حقیقت نہیں؟ وہ چیز جو قریب نظر آتی ہے۔ لفظ ''دنیا'' کا مطلب ہی یہی ہے: وہ چیز جو پست ہو، کمتر ہو، نیچی ہو۔ دنیا وہ چیز ہے جو قریب ترین معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ محض نظر کا دھوکہ ہے۔

کوئی چیز اس سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔

ایک لمحے کو سوچئے کہ آپ کے سب سے زیادہ نزدیک کون ہے۔ اگر یہ سوال پوچھا جائے تو بہت سوں کا جواب ہوگا کہ دل اور نفس نزدیک ترین ہوتے ہیں، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

''ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان

سے ہم واقف ہیں اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔" (سورۂ ق: ۱۶)

اس آیۂ مبارکہ کا آغاز اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں یہ بتا کر کرتا ہے کہ وہ ہماری کوششوں سے واقف ہے۔ یہ جان کر دل کو سکون ملتا ہے کہ کوئی ہماری کاوشوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارا نفس ہمیں کس طرف راغب کرتا ہے۔ مگر وہ ہمارے زیادہ نزدیک ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ شہ رگ کا ذکر ہی کیوں؟ ہمارے اس عضو میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ شہ رگ سب سے اہم رگ ہے جو دل تک خون پہنچاتی ہے۔ اگر یہ کاٹ دی جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ہماری موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ہماری "رگِ جاں" ہے۔ مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہماری اپنی زندگی سے بھی زیادہ، ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے۔ اور وہ ہمارے دل تک جانے والے سب سے اہم رستے سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔

ایک اور آیۂ مبارکہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

"اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (ﷺ) کے کہے کو بجا لاؤ جب کہ رسول (ﷺ) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے اور بلاشبہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔"

(سورہ الانفال: ۲۴)

اللہ کو علم ہے کہ ہمارے ساتھ ایک نفس جڑا ہوا ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ ہمارے پاس ایک دل ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ یہ دونوں چیزیں ہمیں متحرک کرتی ہیں۔ تاہم، اللہ ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ وہ ان دونوں سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔ لہٰذا جب ہم ماسوا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو نہ صرف ہم ایک ایسی چیز کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوتے ہیں جو کہ کمزور ہے بلکہ ہم اپنے نزدیک موجود ہستی کو چھوڑ کر کسی دور کی چیز سے رجوع کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔

سبحان اللہ!

لہٰذا چونکہ یہ ہماری فطرت ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بخوبی علم ہے، وہ ہماری حفاظت کرتا ہے اور مشکل وقت کے دوران باقی سارے دروازے بند کر کے ہماری راہ سیدھی کر دیتا ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ ہر نقلی دروازے کے پیچھے ایک کھائی ہے۔ اور اگر ہم نے اس دروازے میں قدم رکھا تو اس کھائی میں جا گریں گے۔ اپنی رحمت کی بدولت، وہ ان نقلی دروازوں کو بند رکھتا ہے۔

اپنی رحمت ہی کی بدولت اس نے طوفان نازل کیا تا کہ ہم امداد واعانت ڈھونڈنے پر مجبور ہوں۔ اور پھر یہ جانتے ہوئے کہ ہم غلط جواب منتخب کر سکتے ہیں، اس نے ہمیں ایک کثیر الانتخابی امتحانی پرچہ دیا جس میں منتخب کرنے کے لئے صرف ایک ہی جواب دیا گیا تھا: درست جواب۔ مشکل بجائے خود آسانی ہے۔ دیگر تمام سہارے، تمام کثیر الانتخابی جواب، پرے ہٹا کر اس نے امتحان کو ہمارے لئے آسان بنا دیا۔

جب طوفان آیا ہو تو قدم جما کے کھڑے ہونا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ اور یہی نکتے کی بات ہے۔ طوفان بھیج کر اللہ ہمیں گھٹنوں کے بل بٹھا دیتا ہے جو کہ دعا کرنے کے لئے موزوں ترین حالت ہے۔

جنت میں اپنے گھر کو دیکھنا: خدائی مدد کے حصول کے موضوع پر

میں ایک کہانی سے واقف ہوں جو محض ایک کہانی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کے بارے میں ہے جس نے ایک ایسی چیز سے محبت کی جو اس زندگی کی چمک دمک سے بڑھ کر تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے کبھی اپنے تکلیف دہ حالات کو اپنی پہچان بننے یا اپنی تحدیدات کا تعین کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کا ایمان اتنا مضبوط تھا کہ وہ اس کے لئے جان دینے کو تیار تھی۔ وہ ایک ملکہ تھی لیکن اس دنیا کے تاج وتخت اور محلات کی حقیقت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ اس دنیا میں اپنے محل کی حقیقت جانتی تھی اور اس کے بجائے اگلے جہان میں اپنے محل پر نگاہیں مرکوز کیئے ہوئے تھی۔ لیکن فرعون کی بیوی آسیہ کے لئے یہ جنت محض ایک استعارہ نہ تھی۔ اس نے یہ منظر خود اپنی مادی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی جبکہ اس نے دعا کی اے میرے رب! میرے لئے اپنے پاس جنت میں مکان بنا اور مجھے فرعون سے اور اس کے عمل سے بچا اور مجھے ظالم لوگوں خلاصی دے۔'' (سورہ التحریم:۱۱)

میں نے بی بی آسیہ کی کہانی ان گنت مرتبہ سنی ہے، اور ہر مرتبہ اس نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ مگر کچھ عرصہ پہلے، اس کہانی نے ایک بالکل مختلف وجہ کے لئے مجھے متاثر کیا۔ چند ماہ پہلے مجھے ایک کٹھن آزمائش کا سامنا تھا، اور اگر آپ کو راست باز، فرشتہ صفت لوگوں کی رفاقت میسر ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ جب آپ مشکل میں ہوں تو صرف ایک ٹیکسٹ میسج، ایک فیس بک پوسٹ، صہیب ویب لسٹ سرو (Suhaibwebb listserve) کو ایک ای میل کی بدولت، خوبصورت ارواح کی ایک فوج آپ کے لئے دعا گو ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ۔

لہٰذا میں نے درخواست کی۔ میں نے وہ عظیم ترین تحفہ مانگا جو ایک انسان کسی دوسرے کو انسان کو دے سکتا ہے۔ میں نے مخلصانہ دعا کی درخواست کی۔ جو مجھے ملا، اس نے مجھے دم بخود کر کے رکھ دیا۔ میں اللہ کے اس تحفے کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ لوگ رات کے قیام میں، کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر، سفر کے دوران، یہاں تک کہ اپنے بچے کو جنم دیتے ہوئے بھی میرے لئے دعائیں کر رہے تھے۔ مجھے بہت سی دعائیں ملیں، لیکن ایک دعا ایسی تھی جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ ایک سادہ سا ٹیکسٹ میسج تھا مگر اس میں لکھا تھا: ''اللہ کرے کہ آپ کو جنت میں اپنا گھر دکھا دیا جائے تا کہ ہر مشکل آپ کے لئے آسان ہو جائے۔'' میں نے اس پڑھا اور اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ حقیقی معنوں میں ہلا کر رکھ دیا۔

اور پھر مجھے بی بی آسیہ کی کہانی یاد آئی، اور اچانک مجھ پر ایک حیران کن بات آشکار ہوئی۔ بی بی آسیہ کو ناقابل تصور اذیتوں سے گزارا جا رہا تھا۔ فرعون تاریخ کا سب سے جابر حکمران تھا۔ وہ محض بی بی آسیہ پر حکمران نہیں تھا۔ وہ ان کا شوہر بھی تھا۔ اور بی بی آسیہ کے آخری لمحات میں، فرعون نے انہیں ظالمانہ اذیت رسانی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ بی بی آسیہ مسکرانے لگیں۔ وہ ناقابل برداشت اذیت سے گزر رہی تھیں مگر

پھر بھی مسکرا رہی تھیں۔

یہ کیسے ہوا؟ یہ کیسے ہوا کہ ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جانے کے باوجود وہ مسکرانے لگیں؟ ہمیں تو ایک ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑ جائے یا کوئی تیکھی نگاہوں سے ہمیں دیکھ ہی لے تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ یہ کیسے ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک شدید ترین آفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آگ ان کے لئے ٹھنڈی ہوگئی؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کے نام پر بعض لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا مگر ان کے منہ سے کبھی شکایت کا کلمہ نہیں نکلتا، جبکہ مال و متاع سے لدے پھندے لوگ ہر بات پر شکایت کرتے نظر آتے ہیں؟ یہ کیسے ہوتا ہے کہ بعض اوقات زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر ہم ایسے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ہمیں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے میسر نہیں ہوتا؟

میں سمجھا کرتی تھی کہ آفات کٹھن ہوتی ہیں کیونکہ معروضی طور پر بعض چیزوں کو برداشت کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ مشکلات کی کوئی ''ماسٹر لسٹ'' موجود ہے، کوئی درجہ بندی موجود ہے۔ مثال کے طور پر، کسی عزیز کی موت کو برداشت کرنا، گاڑی کا چالان کروانے کے مقابلے میں، ہمیشہ زیادہ مشکل ہوگا۔ بالکل سامنے کی بات لگتی ہے۔

لیکن، یہ غلط بھی ہے۔

کسی آفت کو برداشت کرنا اس لئے مشکل نہیں ہوتا کیونکہ آفت بجائے خود سخت ہوتی ہے۔ کسی مشکل کی نرمی یا سختی کا پیمانہ مختلف ہے..... ظاہری آنکھوں سے یہ پیمانہ نظر نہیں آتا۔ مجھے زندگی میں جس کسی چیز کا سامنا ہوگا، وہ مشکل یا آسان ہوگی، اس لئے نہیں کہ یہ حقیقتاً مشکل یا آسان ہے۔ آسانی یا مشکل کا تعین خدائی مدد سے ہوتا ہے۔ کوئی چیز آسان نہیں، تاوقتیکہ خدا اسے میرے لئے آسان نہ بنا دے۔ کوئی ٹریفک جام آسان نہیں۔ کاغذ سے لگ جانے والا کٹ آسان نہیں۔ اور کوئی چیز کٹھن نہیں، اگر اللہ اسے میرے لئے آسان بنا دے۔ بیماری کٹھن نہیں، موت کٹھن نہیں، آگ میں ڈال دیا جانا کٹھن نہیں، جابر حکمران کا ظلم وستم سہنا کٹھن نہیں۔

ابن عطا اللہ السکندری نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا:

''کوئی چیز مشکل نہیں، اگر آپ اسے اپنے رب کے ذریعے حاصل

کرنے کی کوشش کریں، اور کوئی چیز آسان نہیں، اگر آپ اسے اپنے
زور بازو سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ انشاء اللہ ہم میں سے کسی کو زندگی میں ایسی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسا فرد نہیں جسے اپنی زندگی میں جذباتی، نفسیاتی یا معاشرتی حوالے سے آگ میں نہ جھونکا جائے۔ اور یہ گمان بھی نہ کیجئے کہ اللہ ایسی کسی آگ کو ہم پر ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔ بی بی آسیہ کو جسمانی طور پر اذیت پہنچائی جا رہی تھی لیکن اللہ نے انہیں جنت میں ایک گھر دکھا دیا۔ اس لئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ہماری مادی آنکھیں اس زندگی میں جنت کو نہیں دیکھ پائیں گی، لیکن اگر اللہ کی مرضی ہو تو ہمارے دل کی آنکھیں اس گھر کو دیکھ سکتی ہیں جو اس نے ہمارے لئے تیار کر رکھا ہے، اور اس طرح ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اور شاید ہم بھی مشکل حالات میں مسکرا سکتے ہیں۔

اس لئے آزمائش بجائے خود مسئلہ نہیں۔ بھوک یا سردی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب بھوک یا سردی درپیش ہو تو ہمارے پاس ضروری اسباب موجود ہے یا نہیں۔ اور اسباب موجود ہو تو نہ ہمیں بھوک ستائے گی نہ سردی تنگ کرے گی۔ ان سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ مسئلہ صرف اسی وقت ہو گا جب بھوک ستائے اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ مسئلہ اس وقت ہو گا جب برفانی طوفان نازل ہو اور ہمارے پاس کوئی پناہ گاہ نہ ہو۔

درحقیقت اللہ آزمائشیں بھیجتا ہے تاکہ ان کے ذریعے ہماری تطہیر ہو، ہمیں قوت ملے اور ہم اس کی طرف لوٹ آئیں۔ لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ بھوک، پیاس اور سردی کے ساتھ، اللہ خوراک، پانی اور پناہ گاہ بھی بھیجتا ہے۔ اللہ آزمائش نازل کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ صبر بھی عطا کر سکتا ہے، اور اسے برداشت کرنے کے لئے دل جمعی بھی۔ ہاں، اللہ نے آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں اتارا جہاں انہیں جدوجہد کرنا پڑی اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اللہ نے اپنی مدد بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے:

فرمایا، تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن
ہو، اب تمہارے پاس جب کبھی میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جو میری

ہدایت کی پیروی کرے، نہ تو وہ بھٹکے گا نہ تکلیف میں پڑے گا۔''

(سورہ طٰہٰ: ۱۲۳)

شاید میری پسندیدہ ترین دعاؤں میں سے ایک وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف میں مانگی۔ خون میں لت پت اور زخموں سے چور ہو کر انہوں نے اپنے رب سے کہا:

''میں تیرے چہرے کے نور میں پناہ طلب کرتا ہوں جس کی بدولت ہر تاریکی دور ہو جاتی ہے اور اس جہان اور اگلے جہان کا ہر معاملہ درست ہو جاتا ہے۔''

بے شک اللہ جنہیں عزیز رکھتا ہے ان کی آزمائش کرتا ہے اور آزمائش کی شدت ان کے ایمان کی مضبوطی کے حساب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اللہ اپنی مدد بھی بھیجتا ہے جس کے ذریعے ہر آزمائش آسان ہو سکتی ہے اور ہر آگ ٹھنڈی پڑ سکتی ہے۔ اللہ اپنی مدد ایسے بھی بھیج سکتا ہے کہ اس کے نور اور اس کے پاس اپنے گھر کی ایک جھلک ہمیں مسکرانے پر آمادہ کر دے..... خواہ اس وقت آزمائش کے شعلوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر ہی کیوں نہ رکھا ہو۔

دوسروں سے پہنچنے والی تکلیف کو جھیلنا اور شفا پانا

بلوغت کے مراحل طے کرنے کے دوران، دنیا میرے لئے ایک کامل ترین جگہ تھی۔ واحد مسئلہ یہ تھا کہ یہ کامل نہیں تھی۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ ہر چیز ہمیشہ ''منصفانہ'' ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہئے، اور اگر زیادتی ہو جائے تو انصاف ملنا چاہئے۔ چیزوں کو اپنی سوچ کے مطابق بنانے کے لئے میں نے بہت جان ماری۔ تاہم اپنی جدوجہد کے دوران، اس زندگی کے حوالے سے ایک بنیادی صداقت میری نگاہوں سے اوجھل رہ گئی۔ اپنی بچگانہ مثالیت پسندی میں، میں یہ سمجھ نہ پائی کہ یہ دنیا اصلاً ناقص ہے۔ ہم بطور انسان اصلاً ناقص ہیں۔ اس لئے ہم سے ہمیشہ غلطیاں ہوں گی، اور ان غلطیوں کے نتیجے میں ہم لازماً دوسروں کو ٹھیس پہنچائیں گے، جانتے بوجھتے اور انجانے میں، دانستہ اور نادانستہ طور پر۔ دنیا ہمیشہ منصفانہ نہیں ہوگی۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ناانصافی کے خلاف لڑنا بند کر دینا چاہئے یا صداقت کو

رَد کر دینا چاہئے؟ یقیناً نہیں، مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا...... اور دوسروں...... کو ایک غیر حقیقت پسندانہ معیار پر نہیں پرکھنا چاہئے۔ مگر ایسا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ ہم ایک ایسی دنیا میں کیسے رہ سکتے ہیں جو خامیوں سے اس قدر پُر ہے، جہاں لوگ ہمیں مایوس کرتے ہیں، اور ہمارے اپنے گھر والے ہمارا دل توڑ سکتے ہیں؟ اور شاید، سب سے مشکل بات یہ کہ جب ہمارے ساتھ زیادتی ہو تو ہم درگزر کرنا کیسے سیکھیں؟ ہم سخت دل ہوئے بغیر سخت جان کیسے بنیں، اور کمزور ہوئے بغیر نرم کیسے بنیں؟ کب ہمیں ڈٹ کر کھڑے ہونا ہوتا ہے اور کب پیچھے ہٹ جانا ہوتا ہے؟ کب کسی چیز کی بہت زیادہ پرواہ، حد سے زیادہ ہو جاتی ہے؟ اور کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم حد سے زیادہ محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟

ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا آغاز کرنے کے لئے، ہمیں پہلے اپنی زندگیوں سے باہر قدم رکھنا ہوگا۔ ہمیں یہ جائزہ لینا ہوگا کہ جنہیں تکلیف اٹھانا پڑتی ہے یا جن کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، ان میں ہمارا نمبر پہلا ہے یا آخری۔ ہمیں ان پر نگاہ ڈالنا ہوگی جو ہم سے پہلے آئے، ان کی جدوجہد کا، اور ان کی کامیابیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نشوونما تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اور کامیابی کوشش کے بعد ہی ملتی ہے۔ تقریباً ہمیشہ اس کوشش کا ایک حصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کو برداشت کیا جائے اور ان پر غالب آیا جائے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی درخشاں مثالوں پر نگاہ ڈالنے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہماری تکلیف دوسروں سے الگ تھلگ نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ ساڑھے نو سو سال تک انہیں ایذائیں پہنچاتے رہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے:

"ان سے پہلے قوم نوح نے بھی ہمارے بندے کو جھٹلایا تھا اور دیوانہ بتلا کر جھڑک دیا تھا۔" (سورہ القمر: ۹)

حضرت نوح علیہ السلام کو اتنی تکالیف پہنچائی گئیں کہ بالآخر انہوں نے اپنے رب سے دعا کی:

"......میں بے بس ہوں تو میری مدد کر۔" (سورہ القمر: ۱۰)

یا ہم یہ یاد کر سکتے ہیں کہ کیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر پتھر برسائے گئے اور انہیں لہولہان کر دیا گیا، اور کیسے ان کے اصحابؓ کو مارا پیٹا گیا اور بھوکا رہنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ سب تکالیف انہیں دوسروں کے ہاتھوں پہنچیں۔ فرشتے بھی ہمارے تخلیق کئے جانے سے پہلے سے انسانی فطرت کے اس پہلو سے واقف تھے۔ جب اللہ نے فرشتوں کو آگاہ کیا کہ وہ انسان کی تخلیق کرے گا تو ان کا پہلا سوال انسانوں کی فطرت میں شامل شر کے اس عنصر کے بارے میں ہی تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں کو کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے کہا کہ ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے۔'' (سورۃ بقرہ: ۳۰)

ایک دوسرے کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کی یہ انسانی قوت اس زندگی کی ایک افسوس ناک حقیقت ہے۔ اور اس کے باوجود ہم میں سے بہت سوں پر اللہ کا کرم رہتا ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر کو ایسی صعوبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو بہت سے دوسروں کو ہمیشہ سے بھگتنا پڑتی رہی ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر پر کبھی ایسا وقت نہیں آئے گا جب ہمارے گھر والوں کو ہماری نگاہوں کے سامنے اذیتوں سے گزارا جائے یا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اور اس کے باوجود، ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو کہہ سکیں کہ ہمیں کبھی کسی طرح سے، کسی دوسرے فرد کی وجہ سے تکلیف نہیں پہنچی۔ لہٰذا اگرچہ ہم میں سے زیادہ تر کو کبھی بھوکوں مرنے یا بے چارگی کے عالم میں اپنے گھروں کو تباہ ہوتا دیکھنے کے احساس سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا، لیکن ہم میں سے زیادہ تر کو علم ہے کہ دل کی چوٹ پر کراہ اٹھنا کیسا ہوتا ہے۔

کیا اس سے بچنا ممکن ہے؟ میرے خیال میں کسی حد تک ایسا ممکن ہے۔ تکلیف سے ہمیشہ نہیں بچا جا سکتا لیکن اپنی توقعات، اپنے ردِعمل، اور اپنے فوکس کو درست ترتیب دے کر ہم بہت سی تکالیف سے بچ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اپنے سارے اعتبار، انحصار اور امید کا مرکز کسی ایک فرد کو بنا لینا غیر حقیقت پسندانہ ہی نہیں احمقانہ بھی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے اور لہٰذا، ہمارا حتمی و قطعی اعتبار، انحصار اور امید صرف اللہ کی ذات میں مرکوز

ہونا چاہئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"...جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" (سورۂ بقرہ:۲۵۶)

یہ جان لینا کہ اللہ ہی ایسا آسرا ہے جو کبھی ٹوٹے گا نہیں، ہمیں بہت سی غیر ضروری مایوسیوں سے بچالے گا۔

تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں محبت نہیں کرنی چاہئے یا کم محبت کرنی چاہئے۔ اللہ کے سوا کسی کو ہماری محبت کا حتمی و قطعی مرکز نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے دلوں میں اللہ سے اوپر کسی کا مقام نہیں ہونا چاہئے، اور ہمیں کبھی ایسے موڑ پر نہیں پہنچنا چاہئے جہاں ہم اللہ کے علاوہ کسی اور سے اس انداز میں محبت کریں کہ اس کے بغیر زندگی کا تسلسل جاری رکھنا ناممکن ہو جائے۔ اس طرح کی "محبت" محبت نہیں بلکہ فی الحقیقت عبادت ہے اور اس کی وجہ سے تکلیف کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

لیکن جب ہم نے یہ سب کر لیا ہو اور پھر بھی دوسروں سے ہمیں تکلیف پہنچے یا ہمارے ساتھ زیادتی ہو، جیسا کہ ہوتا ہی ہے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟ ہم دشوار ترین کام کیسے کر سکتے ہیں؟ ہم معاف کرنا کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ ہم اپنے زخموں پر مرہم رکھنا اور دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیسے جاری رکھ سکتے ہیں، اس وقت بھی جب وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے؟

حضرت ابوبکرؓ صدیق کی کہانی میں ہمیں اسی حوالے سے ایک نہایت خوبصورت مثال ملتی ہے۔ جب ان کی بیٹی حضرت عائشہؓ پر بدترین بہتان لگایا گیا تو ابوبکرؓ صدیق کو پتہ چلا کہ اس افواہ کا آغاز کرنے والے ان کے خالہ زاد مسطح تھے، جن کی وہ مالی مدد کیا کرتے تھے۔ فطری بات تھی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مدد کرنا بند کر دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اللہ نے یہ آیہ مبارکہ نازل کی:

"تم میں سے جو بزرگی اور کشادگی والے ہیں انہیں اپنے قرابت داروں اور مسکینوں اور مہاجروں کو فی سبیل اللہ دینے سے قسم نہ کھا لینی چاہئے،

کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف فرما دے؟ اللہ قصوروں کو معاف فرمانے والا ہے۔'' (سورہ النور: ۲۲)

اس آیت کو سن کر حضرت ابوبکرؓ نے فیصلہ کیا کہ وہ اللہ کی بخشش چاہتے ہیں، اور لہٰذا انہوں نے نہ صرف مالی اعانت کا سلسلہ پھر سے جاری کر دیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کر دیا۔

اس طرح کا درگزر مومن ہونے کی عین بنیاد ہے۔ ان مومنوں کے بارے میں بتاتے ہوئے اللہ ارشاد فرماتا ہے:

''اور کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت (بھی) معاف کر دیتے ہیں۔'' (سورہ الشوریٰ: ۳۷)

فوراً معاف کر دینے کی اہلیت کے پس پردہ محرک ہمارے اپنے نقائص اور دوسروں کے حوالے سے ہماری غلطیوں سے باخبری ہونا چاہئے۔ مگر سب سے بڑھ کر، ہماری عاجزی کا محرک یہ حقیقت ہونی چاہئے کہ ہر روز جب ہم گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو اللہ معاملے میں ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ کے مقابلے میں ہماری حیثیت کیا ہے؟ اور اس کے باوجود کائنات کا مالک، ہمارا رب، ہمارے ہر دن اور ہر رات معاف کر دیتا ہے۔ ہماری کیا حیثیت ہے کہ دوسروں کو معاف نہ کریں؟ اگر ہم اللہ سے بخشش کی امید رکھتے ہیں تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم دوسروں کو معاف نہ کریں؟ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی:

''جو دوسروں پر رحم نہیں کرتے، اللہ ان پر رحم نہیں کرے گا۔''

(صحیح مسلم)

ہمیں معاف کر دینے کی تحریک ملنی چاہئے، اللہ کے رحم کی اور ایک روز اس واحد دنیا میں داخل ہونے کی امید سے جو کہ حقیقی معنوں میں کامل اور بے عیب ہے۔

زندگی کا خواب

یہ محض ایک خواب تھا۔ ایک لمحے کو یہ مجھ پر غالب آ جاتا ہے۔ لیکن اپنے خواب میں جو تکلیف مجھے محسوس ہوتی ہے، وہ محض ایک واہمہ ہے۔ ایک عارضی چیز۔ پلک جھپکنے کی طرح۔ لیکن مجھے خواب کیوں آتے ہیں؟ مجھے اپنی نیند کے دوران اس زیاں، خوف اور حزن کو محسوس

کیوں کرنا پڑتا ہے؟

ایک بلند تر پیمانے پر، یہ ایک ایسا سوال ہے جو کہ ہمیشہ سے پوچھا جاتا رہا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کے لئے اس سوال کے جواب نے ایمان کی طرف...... یا ایمان سے دور...... لے جانے والی راہ کا تعین کیا۔ خدا پر ایمان، زندگی کے مقصد پر ایمان، کسی بلند تر نظامِ قدرت یا کسی آخری منزل پر ایمان، سب کا انحصار اس ایک سوال کے جواب پر رہا ہے۔ اور اس سوال کو پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے حتمی و قطعی انداز میں زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے۔

ہم تکلیف میں مبتلا کیوں ہوتے ہیں؟ ''اچھے'' لوگوں کے ساتھ ''برا'' کیوں ہوتا ہے؟ اگر معصوم بچے بھوکے مرتے ہیں اور مجرم آزاد گھومتے ہیں تو پھر خدا کا وجود کیسے ہوسکتا ہے؟ ایک سب سے محبت کرنے والا، سب پر قدرت رکھنے والا خدا کیسے ہوسکتا ہے جو ایسی بدنصیبیوں کے ظہور کی اجازت دے؟

اگر خدا واقعی انصاف پسند اور صاحب خیر ہے، تو کیا ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ صرف اچھا ہو اور برے لوگوں کے ساتھ صرف برا ہو؟

جواب ہے کہ جی ہاں۔ بالکل۔ اچھے لوگوں کے ساتھ صرف اچھا ہی ہوتا ہے۔ اور برے لوگوں کے صرف برا ہی ہوتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ خدا سب سے بڑھ کر عادل اور سب سے بڑھ کر محبت کرنے والا ہے۔ اس کے علم اور فہم میں کوئی نقص نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علم اور فہم میں نقائص پائے جاتے ہیں۔

دیکھئے، اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ ''اچھے لوگوں کے ساتھ صرف اچھا ہی ہوتا ہے اور برے لوگوں کے ساتھ صرف برا ہی ہوتا ہے''، ہمیں پہلے ''اچھے'' اور ''برے'' کی تعریف کا تعین کرنا پڑے گا۔ اور اگرچہ اچھے اور برے کی اتنی ہی تعاریف موجود ہیں جتنے کہ دنیا میں لوگ ہیں، ایک جامع تفہیم بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر، زیادہ تر لوگ اتفاق کریں گے کہ کسی خاص معاملے میں اپنا مطلوبہ مقصد یا ہدف حاصل کر لینا ''اچھا'' ہوگا۔ جبکہ دوسری طرف، مطلوبہ مقصد یا ہدف حاصل نہ کر پانا برا ہوگا۔ اگر میرا مقصد وزن بڑھانا ہے کیونکہ میرا وزن خطرناک حد تک کم ہے، تو وزن کا زیادہ ہو جانا میرے لئے اچھا ہوگا۔ دوسری طرف، اگر میرا

مقصد وزن گھٹانا ہے کیونکہ میرا وزن نقصان دہ حد تک زیادہ ہے، تو وزن کا زیادہ ہو جانا میرے لئے برا ہوگا۔ مطلوبہ مقصد کے مطابق، ایک ہی واقعہ اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میری نگاہ میں ''اچھے'' کا تعلق میرے ذاتی ہدف کے حصول کے ساتھ ہے۔ اور مطلق ''اچھے'' کا تعلق اپنے حتمی ہدف کا حصول ہے۔

لیکن میرا ہدف کیا ہے؟

یہاں ہم وجود کی عظیم تر حقیقت کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے مقصد کے بنیادی سوال تک پہنچتے ہیں۔ جب مقصد حیات کی بات ہوتی ہے تو بنیادی طور پر دو نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں۔ پہلے نقطہ نظر کے مطابق، یہ زندگی ہی واحد حقیقت ہے، آخری منزل ہے اور ہماری کوششوں کا حتمی ہدف ہے۔ دوسرے نقطہ نظر کے مطابق، یہ زندگی محض ایک پُل ہے، ایک ذریعہ ہے جو خدا کی لامتناہی حقیقت کے سیاق وسباق میں ایک جھلک سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔

پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ زندگی ہی سب کچھ ہے۔ ان کے لئے یہ زندگی ہی منزل و مقصد تک ہے اور تمام کوششیں اسی کے حصول کے لئے کی جاتی ہیں۔ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ زندگی صفر کے نزدیک تر ہے۔ کیوں؟ کیونکہ لامتناہیت کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو بڑے سے بڑا عدد بھی صفر بن جاتا ہے۔ لاشے۔ ایک عارضی خواب کی طرح۔

یہ مخصوص نقطہ ہائے نظر مقصد کے سوال پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھئے، اگر کوئی سمجھے کہ یہ زندگی ہی حقیقت ہے، آخری منزل ہے، تمام کوششوں کا ہدف ہے تو زندگی کا مقصد یہی رہ جائے گا کہ زیادہ سے زیادہ لذائذ جسمانی اور مادی منفعتیں حاصل کی جائیں۔ اس تصور کے مطابق، ''اچھے'' لوگوں کے ساتھ ''بری'' باتیں درحقیقت ہر لحظہ وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ اس تصور کے اندر رہتے ہوئے لوگ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا میں انصاف نام کی کسی شے کا وجود نہیں اور لہٰذا یا تو خدا کا وجود نہیں اور یا خدا عادل نہیں ہے (نعوذ باللہ)۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچے کہ چونکہ اس نے ایک برا خواب دیکھا، اس لئے خدا کا کوئی وجود

نہیں۔ لیکن ہم اپنے خوابوں میں ہونے والے تجربات کو زیادہ اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ بعض خواب تو بہت ہی بھیانک ہوتے ہیں...... اور اکثر اوقات ''اچھے'' لوگوں کو ہی آتے ہیں۔ کیا اپنے خوابوں میں ہمیں بے پناہ دہشت یا بے پناہ فرحت کا تجربہ نہیں ہوتا؟ ہاں، ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے اہمیت کیوں نہیں دیتے؟

کیونکہ جب اسے حقیقی زندگی کے سیاق وسباق میں رکھا جاتا ہے تو یہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔

دوسرے نقطہ نظر (اسلامی تصور) میں، مخلوق کا مقصد ایک ایسی زندگی میں زیادہ سے زیادہ لذائذ جسمانی اور منفعت کا حصول نہیں جو اپنی اصل میں ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس نقطہ نظر کے مطابق، زندگی کا مقصد تعین اللہ کرتا ہے جو ہمیں بتاتا ہے:

> ''میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔'' (سورہ الذاریٰت:۵۶)

اس بیان کی خصوصی ساخت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کا آغاز ایک تردید سے ہوتا ہے: ''میں نے انسانوں اور جنوں کو محض اس لئے پیدا کیا ہے......'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ پہلے تمام دیگر مقاصد کی نفی کرتا ہے، اس کے بعد واحد مقصد حیات کو بیان کرتا ہے: ''...... کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیت ایک مومن مجھے معلوم ہے کہ میرے وجود کا اور کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی ذات کو جانوں، اس سے محبت کروں اور اس کا قرب حاصل کروں۔ میری تخلیق صرف اور صرف اسی مقصد کے لئے ہوئی۔ اور یہ سب سے بنیادی تفہیم ہے، کیونکہ میرے ہر کام اور ہر عقیدے کا تعین اسی سے ہوتا ہے۔ میرے گرد وپیش کی تمام چیزوں کا، اور میری زندگی کے ہر تجربے کا تعین اسی سے ہوتا ہے۔

لہٰذا ''اچھے'' اور ''برے'' کے معنی کی طرف لوٹتے ہوئے، ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک قطعی مفہوم کے تحت، جو چیز بھی ہمیں ہمارے حتمی مقصد کے نزدیک لائے، وہ اچھی ہے اور جو چیز ہمیں اس سے دور لے جائے، وہ بری ہے۔ تقابلی اعتبار سے، جن کا مقصد اس مادی دنیا کا حصول ہے، ان کے لئے ''اچھے'' اور ''برے'' کا تعین دنیاوی اسباب سے ہوتا ہے۔ ان کے

لئے دولت، مرتبہ، شہرت یا جائیداد حاصل کرنا بنیادی طور پر ''اچھا ہے۔'' دولت، مرتبے، شہرت یا جائیداد سے محروم ہونا بنیادی طور پر ''برا'' ہے۔ اس نمونے کے مطابق، جب کوئی معصوم و بے خطا فرد اپنی ہر دنیاوی ملکیت سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک ''اچھے'' انسان کے ساتھ ''برا'' ہوا۔ لیکن یہ وہ واہمہ ہے جو ایک ناقص نقطہ نظر رکھنے کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ جب عدسہ ہی بگڑا ہوا ہو، تو اس کے پار دیکھی جانے والی ہر چیز بھی بگڑی ہوئی ہی نظر آئے گی۔

دوسرے نقطہ نظر کے حاملین کے لئے، ہر وہ چیز جو انہیں اپنے مقصد یعنی اللہ کی محبت کے حصول کے نزدیک لاتی ہے، اچھی ہے، اور ہر وہ چیز جو اس مقصد سے دور لے جاتی ہے، بری ہے۔ لہٰذا، اگر ایک ارب ڈالر کا انعام جیتنے کے نتیجے میں، میں اللہ سے، اپنے حتمی مقصد سے، دور ہو جاؤں تو میرے لئے یہ انعام سب سے بڑی آفت ثابت ہوگا۔ دوسری طرف، اگر اپنی ملازمت، اپنی ساری دولت، اور یہاں تک کہ صحت سے بھی محروم ہونے کے نتیجے میں، میں اللہ، اپنے حتمی مقصد کے نزدیک پہنچ جاؤں تو درحقیقت یہ مصائب میرے لئے سب سے بڑی رحمت ہوں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے، جب ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

> ''ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو، حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو۔'' (سورہ البقرہ: ۲۱۶)

بہ حیثیت ایک مومن، اب میرا معیار مادی منفعت یا نقصان نہیں رہا۔ میرا معیار اس سے بلند تر ہے۔ مادی اعتبار سے کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کی اہمیت بس اسی حد تک ہے، جس حد تک یہ مجھے میرے مقصد یعنی اللہ کی ذات کے نزدیک لاتی ہے یا اس سے دور لے جاتی ہے۔ اس دنیا کی حیثیت اس خواب سے زیادہ نہیں رہتی جو میں نے ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر میں بیدار ہوگئی۔ وہ خواب میرے لئے اچھا تھا یا برا، اس کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ بیدار ہونے کے بعد میری کیفیت کیا تھی۔

لہٰذا حتمی پیمانے پر کامل عدل نظر آتا ہے۔ اللہ صرف اچھے لوگوں کو اچھائی (اپنا قرب)

عطا کرتا ہے، اور برے لوگوں کو برائی (خود سے دوری) دیتا ہے۔ سب سے بڑی اچھائی اللہ کا قرب ہے، اس زندگی میں اور اگلی زندگی میں۔ اور صرف ''اچھے'' لوگوں کو ہی اس سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، اس کے لئے ہر چیز میں خیر ہے...... اور ایسا صرف مومن کے لئے ہے۔ اگر اس تک کوئی رحمت پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا شکر کرتا ہے، جو کہ اس کے لئے اچھا ہے، اور اگر اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو صبر کرتا ہے جو کہ اس کیلئے اچھا ہے۔'' (صحیح مسلم)

جیسا کہ یہ حدیث واضح کرتی ہے، کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا تعین اس کی ظاہری شکل وصورت سے نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے مطابق، ''اچھائی'' کا تعین اس اچھی باطنی کیفیت سے ہوتا ہے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے یعنی صبر اور شکر۔ دونوں خدا کے ساتھ راضی ہونے اور خدا کا قرب پانے کے مظاہر ہیں۔

دوسری طرف، سب سے بڑی آفت اللہ سے دوری ہے، اس زندگی میں اور اگلی زندگی میں۔ اور صرف ''برے'' لوگوں کو ہی اس سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اللہ سے دور ہوئے ان لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہے یا نہیں، مال و دولت، مقام و مرتبہ، نام ونمود، سب ایک واہمہ ہے...... ان کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی کہ کسی اچھے یا برے خواب میں ملنے یا نہ ملنے والی چیزوں کی ہوسکتی ہے۔

ان اوہام کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے:

> ''اور اپنی نگاہیں ہرگز چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آرائش دنیا کی دے رکھی ہیں تا کہ انہیں اس میں آزمالیں تیرے رب کا دیا ہوا ہی (بہت) بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے۔''
> (سورۃ طٰہٰ: ۱۳۱)

ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی وہ ہے، جس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس دنیا کے خواب سے بیدار ہوتے ہیں۔ اور بیدار ہونے کے بعد ہمیں احساس ہوتا ہے......

یہ سب محض ایک خواب تھا۔

بند دروازے اور اندھا کر دینے والے واہمے

کل میرے بائیس ماہ کے بیٹے نے اپنی خودمختاری کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی کار
سیٹ سے اتر کر، اس نے چاہا کہ ایک بڑے بچے کی طرح کار کا دروازہ خود بند کرے، لہٰذا میں
کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے اسے دروازہ بند کرنے دیا تو
اس کا ننھا سا سر گاڑی سے ٹکرا جائے گا، میں نے اسے اٹھا کر گود میں لیا اور دروازہ خود بند کر دیا۔
اس پر اسے بہت برا محسوس ہوا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جس کام کو وہ اتنے شوق سے
کرنا چاہتا تھا، میں اسے میں کرنے سے کیسے روک سکتی تھی؟

اس واقعے کو دیکھتے ہوئے، ایک عجیب سا خیال میرے ذہن سے گزرا۔ مجھے وہ تمام
مواقع یاد آئے جب حقیقی زندگی میں ہمارے ساتھ ایسا ہوا تھا...... جب ہم کسی چیز کو بڑی شدت
سے چاہتے ہیں لیکن اللہ ہمیں اسے حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجھے وہ تمام مواقع یاد
آئے جب، ہم بڑوں کو بھی ایسی ہی جھنجھلاہٹ کا سامنا کرنا پڑا جب معاملات اس انداز میں
نہیں چلے، جس انداز میں کہ ہم انہیں چلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، بڑی شدت کے ساتھ۔ اور پھر
اچانک، سب واضح ہو گیا۔ میں نے اپنے بیٹے کا تحفظ کرنے کیلئے اسے دروازے سے ہٹایا تھا
مگر اسے اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اپنے دکھ اور تکلیف میں، اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ درحقیقت
میں نے اسے بچایا ہے۔ اور جیسے میرا بیٹا اپنی سادہ لوحی اور معصومیت میں رو رہا تھا، بہت مرتبہ ہم
بھی ایسے واقعات پر ماتم کرتے نظر آتے ہیں جنہوں نے درحقیقت ہمیں بچا لیا ہوتا ہے۔
جب ہماری فلائٹ چھوٹ جاتی ہے، کوئی ملازمت ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، یا ہم
اپنی پسند کے فرد سے شادی نہیں کر پاتے، تو کیا کبھی ہم نے رک کر اس امکان پر غور کیا ہے کہ ہو
سکتا ہے یہ سب ہمارے اچھے کے لئے ہی ہوا ہو؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو
اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری
ہو، حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو۔" (سورہ بقرہ:۲۱۶)

لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ ہم سطح تک محدود رہ جانے کے بجائے چیزوں کو گہرائی میں اتر کر دیکھیں۔ بہت قوت چاہیئے، واہموں کے پار، ایک گہری صداقت کو دیکھنے کے لئے...... جو ہوسکتا ہے ہماری سمجھ میں آئے یا ہوسکتا ہے، نہ آئے۔ جیسے میرے بیٹے کو سمجھ نہ آیا کہ جو کام وہ کرنا چاہتا تھا، اس سے روک کر در حقیقت میں اس کا بھلا کر رہی ہوں، اسی طرح اکثر بھی ہم اندھے ہو جاتے ہیں۔

اس کے نتیجے میں، ہم بیٹھے نجانے کتنی دیر تک اپنی زندگی کے بند دروازوں کو گھورتے رہتے ہیں، اور ان دروازوں کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے جو کھل چکے ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی پسند کے فرد سے شادی نہیں کر پاتے، تو اس سے ہٹ کر کسی اور کو دیکھنے سے ہماری معذوری، ہمیں کسی ایسے فرد کو دیکھنے سے محروم رکھ سکتی ہے جو در حقیقت ہمارے لئے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ جب ہمیں ملازمت نہیں ملتی یا ہماری کوئی پیاری چیز کھو جاتی ہے، تو بہت دشوار ہوتا ہے کہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجموعی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے۔ اکثر اللہ ہم سے چیزیں لے لیتا ہے، لیکن ان کے بدلے ہمیں ان سے بہتر چیزیں عطا کر دیتا ہے۔

کوئی المیہ بھی اس انداز میں رونما ہوسکتا ہے۔ ایک بچے سے محرومی سے زیادہ تکلیف دہ مصیبت کا تصور کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بچے سے محرومی بھی ہماری نجات کا سبب بن سکتی ہے اور ہمیں کوئی زیادہ بہتر چیز عطا کر سکتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اگر اللہ کے کسی بندے کا بچہ وفات پا جاتا ہے تو اللہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: ''کیا تم نے میرے بندے کا بچہ لے لیا؟''

فرشتے جواب دیتے ہیں: ''جی ہاں۔''

اللہ ان سے کہتا ہے: ''کیا تم نے اس کے دل کا ٹکڑا چھین لیا؟''

وہ جواب دیتے ہیں: ''جی ہاں۔''

تب اللہ ان سے کہتا ہے: ''میرے بندے نے کیا کہا؟''

فرشتے جواب دیتے ہیں: ''اس نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور کہا: ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

اللہ انہیں حکم دیتا ہے: ''جنت میں میرے بندے کے لئے ایک گھر بنا دو اور اس کا نام

"بیت الحمد" رکھ دو۔" (جامع ترمذی)

جب اللہ ہم سے اولاد جیسی کوئی پیاری چیز لے لیتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس نے بدلے میں کوئی بہتر چیز دینے کے لئے ایسا کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس محرومی کی بدولت ہمیں جنت میں داخلہ مل جائے...... اپنے بچے کے ساتھ ابدی زندگی۔ اور ہماری یہاں کی زندگی کے برعکس، وہ زندگی ہمیشہ رہنے والی ہوگی جہاں ہمارے بچے کو نہ کوئی تکلیف ہوگی نہ خوف، اور نہ کسی بیماری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن اس زندگی میں ہماری بیماریاں بھی ہوسکتا ہے ویسی نہ ہوں جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے دراصل ان کے ذریعے اللہ ہمیں ہمارے گناہوں سے پاک کر رہا ہو۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیز بخار تھا تو آپ نے فرمایا:

"کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، خواہ ایک کانٹا ہی نہ چبھے، جس کی بدولت اللہ اس کے گناہ نہ جھاڑ دیتا ہو جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔" (صحیح بخاری)

ایک اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتاتے ہیں کہ اس کا اطلاق دُکھ اور پریشانی پر بھی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"جب مسلمان پر کوئی مصیبت، بیماری، غم، پریشانی، تکلیف یا یاسیت نازل ہوتی ہے، خواہ ایک کانٹا ہی کیوں نہ چبھے، اللہ اس کی وجہ سے اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔" (صحیح بخاری)

یا پھر غربت کی مثال لیجئے۔ جن لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہے، ان میں سے زیادہ تر اسے کبھی ایک ممکنہ رحمت نہیں سمجھیں گے۔ لیکن قارون کے آس پاس کے لوگوں کے لئے ایسا ہی تھا۔ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ایک شخص تھا جسے اللہ نے اتنی دولت عطا کی تھی کہ اس کے خزانوں کی چابیاں بھی کسی خزانے سے کم نہ تھیں۔ قرآن میں آتا ہے:

"پس قارون پوری آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے مجمع میں نکلا تو دنیاوی زندگی کے متوالے کہنے لگے کاش کہ ہمیں بھی کسی طرح وہ مل جاتا جو

قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا ہی قسمت کا دھنی ہے۔"

(سورہ القصص:۷۹)

لیکن قارون کی دولت نے اسے متکبر، ناشکرا اور اللہ کا باغی بنا دیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"(آخر کار) ہم نے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کے لئے تیار نہ ہوئی نہ وہ خود اپنے بچانے والوں میں سے ہو سکا۔ اور جو لوگ کل اس کے مرتبہ پر پہنچنے کی آرزو مندیاں کر رہے تھے وہ آج کہنے لگے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ بھی؟ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر فضل نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ناشکروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔"

(سورہ القصص:۸۲۔۸۱)

قارون کا حال دیکھنے کے بعد وہی لوگ شکر گزار بن گئے کہ انہیں اس کی دولت سے محفوظ رکھا گیا۔

لیکن غالباً اس سبق کی سب سے عمدہ مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصے میں ملتی ہے جس کے بارے میں ہمیں سورۂ کہف میں بتایا گیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام (جن کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ وہ آدمی کے روپ میں فرشتہ تھے) کے ساتھ سفر کر رہے تھے، تو انہوں نے سیکھا کہ چیزیں اکثر ویسی نہیں ہوتیں جیسا کہ دیکھنے میں نظر آتی ہیں، اور یہ کہ اللہ کی حکمت کو ہمیشہ سطحی طور پر دیکھ کر سمجھا نہیں جا سکتا۔ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بستی میں پہنچے جہاں خضر علیہ السلام نے لوگوں کی کشتیوں میں چھید کرنا شروع کر دیئے۔

بظاہر یہ عمل کشتیوں کے غریب مالکان کے لئے نقصان دہ معلوم ہوگا۔ تاہم، بعد ازاں خضر علیہ السلام نے بتایا کہ درحقیقت وہ ان لوگوں کا تحفظ کر رہے تھے، اور ان کی کشتیوں کو بچا رہے تھے۔ قرآن میں آتا ہے:

''اس (خضر) نے کہا بس یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان، اب میں تجھے ان باتوں کی اصلیت بھی بتا دوں گا جن پر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کا ارادہ کرلیا کیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر (صحیح سالم) کشتی کو جبراً ضبط کرلیتا تھا۔'' (سورہ الکہف: ۷۸-۷۹)

کشتیوں میں چھید کر کے، انہیں اس بادشاہ کے لئے ناقابل قبول بنا کر جو انہیں جبراً ضبط کر رہا تھا، دراصل خضر علیہ السلام لوگوں کا تحفظ کر رہے تھے۔ اور بعض زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں بچانے کے لئے، کوئی چیز ہم سے لے لی جاتی ہے، یا ایسے انداز میں دی جاتی ہے جو ہمیں پسند نہیں ہوتا۔ اور اس کے باوجود، 22 ماہ کے اس بچے کی طرح، ہمیں یہ محض ایک بند دروازہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

تکلیف، نقصان اور اللہ کی طرف جانے والا راستہ

مجھے اب بھی وہ اضطراب یاد ہے۔ اکثر دروں بینی کے بعد جنم لینے والی گہری ناامیدی کی شکار ہو کر، میں اپنے خالق کے حضور فریاد کناں ہوئی۔ میں نے درخواست کی لیکن اس چیز کی نہیں جسے تولا جا سکتا ہے، خریدا جا سکتا ہے، بچا جا سکتا ہے، یا کچھ دے کر لیا جا سکتا ہے۔ میرا اضطراب ایک زیادہ حقیقی دولت کے لئے تھا۔ میری خامیاں اچانک مجھ پر آشکار ہوئیں تو میں اپنے نفس کی آمریت سے آزاد ہونے کے لئے مضطرب ہوگئی۔ میں ایک بہتر انسان بننے کے لئے مضطرب ہوگئی۔

اور لہٰذا، اپنا دل اللہ کے حوالے کرتے ہوئے، میں نے دعا کی کہ میری تطہیر ہو جائے۔ اور اگرچہ اس بات پر ہمیشہ سے میرا پختہ ایمان رہا ہے کہ اللہ دعاؤں کا سننے والا ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری یہ دعا کب یا کیسے قبول ہوگی۔

اس دعا کے کچھ ہی عرصے بعد، میں اپنی زندگی کے مشکل ترین ادوار میں سے ایک سے گزری۔ اس تجربے کے دوران میں نے دل مضبوط کیا اور رہنمائی اور حوصلے کی دعا مانگتی رہی۔ مگر اپنی گزشتہ دعا کے ساتھ اس کا کوئی تعلق مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ اس دور کے گزر جانے کے بعد،

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے، مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیسے بلوغت کی منازل طے کی ہیں۔ اچانک مجھے اپنی دعا یاد آئی۔ اچانک مجھ پر آشکار ہوا کہ مشکل بجائے خود اس دعا کا جواب تھی جو میں نے اس قدر اضطراب کے عالم میں کی تھی۔

رومی کے الفاظ بڑی خوبصورتی سے وضاحت کرتے ہیں: ''جب کوئی قالین کو چھڑی سے پیٹتا ہے تو وہ قالین کو نہیں پیٹ رہا ہوتا...... اس کا مقصد گرد جھاڑنا ہوتا ہے۔ تمہارا باطن ''میں'' کے حجاب کی گرد سے بھرا ہوا ہے، اور یہ گرد یک دم ختم نہیں ہوگی۔ ہر تکلیف اور ہر چوٹ کے ساتھ، یہ تھوڑا تھوڑا کر کے دل کے چہرے سے جھڑتی ہے، بعض اوقات سوتے ہوئے اور بعض اوقات بیداری کے عالم میں۔''

زندگی میں نجانے کتنی مرتبہ ہمیں مختلف طرح کے تجربات ہوتے ہیں، اور اس کے باوجود ہمیں کبھی ان کا باہمی ربط نظر نہیں آتا۔ جب ہم پر مصیبت آتی ہے، یا ہم تکلیف محسوس کرتے ہیں، تو ہم اکثر یہ سوچ نہیں پاتے کہ یہ تجربہ کسی اور فعل یا تجربے کا براہِ راست سبب یا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنی زندگی کی تکالیف اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کے درمیان بلاواسطہ ربط پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔

یہ تکلیف اور مصیبت ہماری زندگی میں کئی طرح سے کام آتی ہیں۔ مصیبت کے ادوار، ہمارے خالق کے ساتھ ہمارے ٹوٹے ہوئے رشتے کی ایک نشاندہی بھی ہو سکتے ہیں اور ایک علاج بھی۔

مصیبت کے ادوار ہمارے ایمان، ہمارے استقلال اور ہماری قوت کی آزمائش کرتے ہیں۔ ایسے وقتوں میں، ہمارے ایمان کا درجہ آشکار ہو جاتا ہے۔ مصیبت ہمارے چہروں پر پڑے ہوئے نقاب نوچ ڈالتی ہے اور ایمان کے محض زبانی اقرار کی حقیقت افشا کر دیتی ہے۔ مصائب حقیقی اقرار کرنے والوں کو جھوٹا اقرار کرنے والوں سے الگ کر دیتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کے صرف اس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے ہیں ہم انہیں بغیر آزمائے ہوئے ہی چھوڑ دیں گے؟ ان

سے اگلوں کو بھی ہم نے خوب جانچا، یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں بھی جان لے گا
جو سچ کہتے ہیں اور انہیں بھی معلوم کر لے گا جو جھوٹے ہیں۔''
(سورہ العنکبوت: ۲۔۳)

مصائب ہماری آزمائش کرتے ہیں۔ مصائب ایک رحمت اور اللہ کی محبت کی ایک نشانی بھی ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب بھی اللہ کسی شخص کی بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، تو اسے افتاد میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

اور اس کے باوجود زیادہ تر لوگ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ مصیبت اچھی کیسے ہو سکتی ہے۔ بہت سوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مصیبت درحقیقت ایک مطہر یعنی پاک کر دینے والی چیز ثابت ہو سکتی ہے جو لوگوں کو ان کے رب کی طرف واپس لے آتی ہے۔ ان متکبر لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے جنہیں اچانک کسی ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑ جاتا ہے جسے وہ کنٹرول نہیں کر سکتے؟ اس شخص کے ساتھ کیا ہوتا ہے جو طوفان کے درمیان سمندر میں خود کو بے یار و مددگار پاتا ہے؟ تب کیا ہوتا ہے جب وہ جہاز جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ''یہ ڈوب نہیں سکتا'' ٹائی ٹینک کی کہانی بن جاتا ہے؟

یہ مفروضہ آفات درحقیقت ہمیں جگانے کا کام کرتی ہیں۔ یہ ہمارا غرور توڑتی ہیں۔ ہمیں ہلا کے رکھ دیتی ہیں۔ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہم کتنے حقیر ہیں اور اللہ کتنا بڑا ہے۔ اور اس طرح یہ ہمیں ہمارے مغالطوں، ہماری بے خبریوں، ہماری آوارہ گردیوں کی نیند سے بیدار کر دیتی ہیں اور ہمیں ہمارے خالق کی طرف واپس لے آتی ہیں۔ مصائب ہماری آنکھوں پر پڑا اطمینان کا پردہ نوچ پھینکتے ہیں، اور ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''......اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بد حالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید باز آ جائیں۔'' (سورہ الاعراف: ۱۶۸)

ایک اور جگہ اللہ بتاتا ہے:

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں نہ پکڑا ہوتا کہ گڑگڑائیں۔''

(سورہ الاعراف: ۹۴)

عاجزی وانکساری کا یہ سبق انسانی روح کی تطہیر کرتا ہے، اس حد تک کہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومنوں کو تسلی دیتے ہوئے یقین دلاتا ہے کہ جو بھی مصیبت ان پر آتی ہے ان کے درجات وفضائل میں اضافہ کرنے کے لئے آتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو وہ لوگ بھی تو ایسے ہی تکلیف پا چکے ہیں، ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کردے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔''

(سورۂ آل عمران: ۱۴۰)

تزکیۂ نفس کی یہی جنگ اللہ کی طرف لے جانے والے راستے کا جوہر ہے۔ اس کا آغاز نفس کی قربانی سے ہوتا ہے، اور اس کی راہ جدوجہد کی مشقت سے ہموار ہوتی ہے۔ یہی وہ راستہ جس کا تذکرہ اللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اے انسان! تو اپنے رب کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے، اور اس سے ملنے والا ہے۔'' (سورہ الانشقاق: ٦)

مصیبت پر ایک مومن کا ردِ عمل

مسلمانوں کے لئے یہ اضطراب کا وقت ہے۔ بعض اوقات، مایوسی سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے سوچ رہے ہیں کہ آخر ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ہم نے کوئی غلط کام بھی نہیں کیا؟ آخر ایک ایسے ملک میں ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کیسے برتا جا سکتا ہے جس کی بنیاد ہی سب کے لئے ''حریت''، ''آزادی'' اور ''انصاف'' پر رکھی گئی ہے؟

اگرچہ یہ سب خیالات قدرتی ہیں، مگر ہمیں ان سے ماوراء دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں

ایک لمحے کے لئے واہمے کے پار اس حقیقت پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جو اس کے عقب میں ایستادہ ہے۔ ہمیں اپنی نگاہوں کو از سرِ نو مرکوز کرنا ہوگا، اگر ہم اس بصری انعکاس کے پار موجود صداقت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صداقت قرآن کے سب سے زیادہ دہرائے جانے والے اسباق اور نبویؐ تعلیمات میں سے ایک ہے۔ وہ بنیادی صداقت یہ ہے: اس زندگی میں ہر چیز ایک آزمائش ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"(وہ اللہ ہے) جس نے موت اور حیات کو اس لئے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں اچھے کام کون کرتا ہے، اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔" (سورہ الملک: ۲)

یہاں ہمیں زندگی اور موت کی تخلیق کا بنیادی مقصد بتایا گیا ہے یعنی ہماری آزمائش۔

ایک لمحے کیلئے ایمرجنسی میں بجائے جانے والے سائرن کے بارے میں سوچیے۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ سائرن ایک علامت اور انتباہ ہے کہ کوئی نقصان دہ چیز نازل ہونے والی ہے۔ اگر ہم اسے سنیں تو فطری طور پر گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن جب سائرن کی آزمائش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ جب محض ہمارا ردِعمل دیکھنے کے لئے مشق کا انعقاد کیا جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ آزمائشی سائرن کی آواز بھی بالکل ویسی ہی ہوتی ہے لیکن یہ "محض ایک آزمائش" ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے میں حقیقی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقی ہوتا نہیں۔ یہ محض ایک آزمائش ہے۔ اور آزمائش کے دوران ہمیں بار بار اس کی یاددہانی کرائی جاتی ہے۔

زندگی کے بارے میں بھی اللہ ہمیں یہی بتاتا ہے۔ یہ دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے میں بہت زیادہ حقیقی معلوم ہوگی۔ بعض اوقات یہ ہمیں خوفزدہ کردے گی۔ بعض اوقات یہ ہمیں رونے پر مجبور کردے گی۔ بعض اوقات یہ ہمیں جم کر کھڑے ہونے...... پہلے سے کہیں زیادہ جم کر کھڑے ہونے کے بجائے بھاگ اٹھنے پر مجبور کردے گی۔ لیکن یہ زندگی اور اس کی ہر چیز محض ایک آزمائش ہے۔ یہ واقعتاً حقیقی نہیں ہے۔ اور ایمرجنسی براڈ کاسٹ سسٹم کے ٹسٹ کی طرح، یہ حقیقی چیز کے لئے ہماری تربیت کررہی ہے۔ یہ ہمیں آزمائشی سائرن سے ماورا حقیقت

کے لئے تربیت دے رہی ہے۔

اب، اگر اس آزمائشی سائرن کا ظہور بے خبری کے عالم میں نہ ہو تو کیا ہوگا؟ اگر ہر گھر میں یہ اطلاع پہنچا دی جائے کہ آزمائش کی جانے والی ہے تو کیا ہوگا؟ ایک لمحے کے لئے اس اطلاع پر غور کیجئے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں پہنچائی ہے:

''یقیناً تمہارے مالوں اور جانوں سے تمہاری آزمائش کی جائے گی اور یہ بھی یقین ہے کہ تمہیں ان لوگوں کی جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے اور مشرکوں کی، بہت سی دکھ دینے والی باتیں بھی سُننی پڑیں گی اور اگر تم صبر کرلو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔''

(سورۂ آل عمران:۱۸۶)

اب تصور کیجئے کہ ان اطلاعات کے علاوہ، ہمیں دیگر کئی اقوام کے بارے میں بھی آگاہ کیا جائے جن کی اسی انداز میں آزمائش کی گئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کیا تم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے، انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔'' (سورۂ بقرہ:۲۱۴)

چنانچہ نہ صرف یہ کہ سائرن کی پیشگی اطلاع مل گئی بلکہ یہ بھی کہ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ فرض کیجئے ہماری قوم کو بتایا جائے کہ ہم منفرد نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سب کے بعد، جب آزمائشی سائرن بجے گا تو ہمارا ردِعمل کیسا ہوگا؟ اگر یہ مشق ہے تو پھر نہ کسی کو صدمہ پہنچتا ہے اور نہ کوئی بے یقینی کا شکار ہوتا ہے۔ ہم گھبراتے نہیں۔ ہم پریشان بھی نہیں ہوتے۔

لیکن ہم حرکت میں ضرور آتے ہیں۔ عمل ضرور کرتے ہیں۔

اور اہم حصہ یہ ہے۔ ہم کس کے لئے عمل کر رہے ہیں؟ ہماری آزمائش کون کر رہا ہے؟ حقیقت میں دیکھ کون رہا ہے؟ سی این این، سی پیین، امریکی عوام؟ نہیں۔ وہ سب اس واہمے کا،

ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر مدد دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی عطا فرمائی اور اللہ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی باتیں مانو گے تو وہ تمہیں تمہاری ایڑیوں پر پلٹا دیں گے (یعنی تمہیں مرتد بنا دیں گے) پھر تم نامراد ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ تمہارا مولا ہے اور وہ ہی بہترین مددگار ہے۔''

(سورۂ آل عمران: ۱۴۶۔۱۵۰)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ قصے ہم تک پہنچاتا ہے تاکہ ہم اپنے سے پہلے آنے والوں کے ردِعمل سے سیکھ سکیں۔ اور ان کا ردِعمل یہ تھا: ''ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔'' ان کا ردِعمل یہ تھا: ''اے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہمارے کاموں میں جو بے جا زیادتی ہوئی ہے اسے بھی معاف فرما اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر مدد دے۔'' ان کا ردِعمل یہ نہیں تھا کہ آزمائش کو دیکھیں۔ ان کا ردِعمل یہ تھا کہ آزمائش کے ماورا دیکھیں۔ انہوں نے واہمے کی حقیقت کو سمجھ لیا اور اس کے عقب میں چھپی ہستی یعنی اپنے رب پر توجہ مرکوز کی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ صرف اس آزمائش کو نازل کرنے والا ہے بلکہ انہیں اس سے بچا بھی صرف وہی سکتا ہے۔ اور لہٰذا انہوں نے توبہ، صبر اور تقویٰ کے ذریعے اللہ کی دستگیری طلب کی۔

لیکن سب سے زیادہ ڈھارس بندھانے والی بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود مومنوں کو تسلی دیتا ہے اور ان کی کامیابی کا وعدہ کرتا ہے:

> ''اور دل شکستہ نہ ہو، اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔ اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو وہ لوگ بھی تو ایسے ہی تکلیف پا چکے ہیں، ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ اور وہ آزمائش کے

ذریعے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔"

(سورۂ آل عمران: ۱۴۲۔۱۳۹)

ایک بار جب ہم وہ چشمہ بدل لیتے ہیں جس کے ذریعے ہم اپنی زندگیوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، تو ہمارے باطنی اور ظاہری ردہائے عمل غیر معمولی طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب ہم سے پہلے نیکوکار لوگوں کی آزمائش ہوئی تو ان کے ایمان اور اطاعت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ قرآن بیان کرتا ہے:

"اور مومنوں نے جب (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو (بے ساختہ) کہہ اٹھے کہ انہی کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا اور اس (چیز) نے ان کے ایمان اور شیوۂ فرماں برداری میں اور اضافہ کر دیا۔" (سورہ الاحزاب: ۲۲)

تاہم جب تک ہم یہ چشمہ تبدیل نہ کریں، ہم اس سوال سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے کہ "ہمارے ساتھ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اور آزمائش کے حقیقی مقصد کا ادراک نہیں کر سکتے یعنی یہ اللہ کا بنایا ہوا ایک طریقہ ہے جس کا مقصد ہمیں مضبوط بنانا اور ہمیں اس ہستی کے نزدیک تر لانا ہے جو آپ کی، میری اور ہمارے سب دشمنوں کی خالق ہے۔

یہ زندگی: زنداں یا جنت؟

میں ایئرپورٹ پر تھی۔ سکیورٹی کی قطار میں کھڑی میں اپنی روایتی تفتیش کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے میں نے ایک چھوٹی سی بچی کو اپنی ماں کے ساتھ دیکھا۔ بچی رو رہی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ ماں نے بچی کی دوا نکالنے کے لئے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اس چھوٹی سی بچی کے چہرے پر تکلیف بھرے تاثرات سے میں بہت متاثر ہوئی اور اچانک میں نے کچھ دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میں کسی ایسے فرد کو دیکھ رہی ہوں جو شکنجے میں پھنسا ہوا

ہے۔ یہ معصوم، پاکیزہ روح ایک دنیاوی جسم میں قید تھی جسے بیمار بھی ہونا تھا، درد بھی محسوس کرنا تھا اور تکالیف بھی بھگتنا تھیں۔

اور پھر مجھے وہ حدیث یاد آئی جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت۔" (صحیح مسلم) اور پہلی بار مجھے اس کا ایک نیا مفہوم سمجھ آیا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ اس حدیث کا غلط مفہوم مراد لیتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ کافر اس دنیا میں زندگی سے محظوظ ہوتے ہیں جبکہ مومنوں کو اس دنیا میں حرام اور حلال کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور لطف اندوزی کے لئے اگلی دنیا کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یا شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مومن کے لئے یہ زندگی دکھوں سے بھری ہے اور کافر کے لئے لذتوں سے معمور ہے۔

لیکن میرے خیال میں ایسا بالکل نہیں ہے۔

اور اچانک مجھے ایسا لگا جیسے اس حدیث کی حقیقت مجھے اس چھوٹی سی بچی میں نظر آ رہی ہے۔ مجھے ایک مقید روح نظر آئی کیونکہ اس کا تعلق ایک الگ دنیا سے، ایک بہتر دنیا سے ہے جہاں اسے بیمار نہیں ہونا پڑتا۔

لیکن جب معاملہ اس کے الٹ ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ جب روح پہلے ہی یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ جنت میں ہے تو کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ روح کہیں اور جانا چاہے گی؟ کسی بہتر جگہ؟ نہیں۔ وہ یہیں رہنا چاہتی ہے۔ اس روح کے لئے، کوئی اور "بہتر" موجود نہیں۔ جب آپ جنت میں ہوتے ہیں، تو کسی بہتر جگہ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کو کسی چیز کی تمنا نہیں ہوتی۔ مزید کچھ درکار نہیں ہوتا۔ آپ جس جگہ ہوتے ہیں، اسی سے مطمئن و مسرور ہوتے ہیں۔ یہ کافر کی حالت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> "جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں ہے اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔" (سورۂ یونس: ۷)

غیر مومن روح کے لئے یہی دنیا، جو ناگزیر طور پر تکالیف سے بھری، مایوس کن اور

عارضی ہے، جنت ہے۔ وہ اس کے علاوہ اور کسی سے واقف ہی نہیں۔ ذرا ایک ایسی دنیا کا تصور کیجئے جہاں آپ کو صرف ایسی ایک جنت کے بارے میں علم ہو جس میں آپ کو گرنا پڑے، خون بہانا پڑے اور بالآخر مر جانا پڑے۔ اس کیفیت کے کرب کا تصور کیجئے۔

وہ جسے اس بات پر یقین نہیں کہ کوئی بہتر مقام بھی موجود ہے...... جو سمجھتا ہے کہ اس دنیا سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں...... جب اسے اس زندگی میں کاملیت نہیں ملے گی تو وہ بہت بے صبر ہو جائے گا۔ وہ جلد غصے میں آ جائے گا اور جلد غم و حزن کا شکار ہو جائے گا کیونکہ اس زندگی کو تو ایک جنت ہونا چاہئے تھا۔ ایسے لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کوئی بہتر مقام موجود ہے۔ اور اسی لئے انہیں اس دنیا کے علاوہ کسی جگہ کی خواہش نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ وہ کسی اور چیز کے لئے جان نہیں مارتے۔ ان کی ہر کوشش، ہر اہلیت، ہر موقع، خالق کی طرف سے ملی ہوئی ہر صلاحیت کا استعمال صرف اس دنیا کی طلب میں ہوتا ہے...... جس میں سے انہیں اتنا حصہ ہی ملے گا جتنا ان کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔

ان کی روح اس دنیاوی جسم سے جڑی ہوئی ہے کیونکہ یہ سمجھتی ہے کہ اس جسم کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی جنت نہیں، یا اسے کوئی جنت کبھی ملے گی ہی نہیں۔ اس لئے وہ اس جسم سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔ کسی بھی قیمت پر وہ اس کے ساتھ جڑے رہنا چاہتی ہے۔ موت کے وقت روح کو اس کی ''جنت'' سے جدا کر دیا جانا سب سے بڑی اذیت ہے۔ اللہ کافروں کی موت کو جسم سے روح کو کھینچ کر جدا کر دیئے جانے کے طور پر بیان کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں (کافروں کی روحیں) سختی سے۔'' (سورہ النازعٰت:۱)

اسے کھینچ کر جدا کیا جاتا ہے کیونکہ روح جانا نہیں چاہتی۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئی تھی کہ وہ جنت میں ہی ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ کوئی ارفع تر مقام بھی موجود ہے۔ کہیں زیادہ ارفع۔

مومن روح کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ مومن جنت میں نہیں، زنداں میں ہوتا ہے۔ کیوں؟ زندانی کیا ہوتا ہے؟ زندانی ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو پھنسا ہوا ہو۔ زندانی کو اپنے گھر سے دور رکھا جاتا ہے جبکہ وہ کسی بہتر مقام پر پہنچنے کا تمنائی ہوتا ہے۔ دنیاوی جسم مومن کے لئے

قید خانہ ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ مومن روح کے لئے یہ دنیا تکلیفوں بھری ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ روح کسی ارفع تر مقام کو جانا چاہتی ہے۔ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ مومن کی زندگی کتنی ہی آسودہ کیوں نہ ہو، اس کامل زندگی کے مقابلے میں یہ ایک زنداں ہی ہے جو کہ اس کی منتظر ہے۔ اس روح کی وابستگی خدا سے اور اس کے پاس موجود حقیقی جنت سے ہوتی ہے۔ یہ روح وہاں پہنچنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ دنیاوی زندگی اس روح کو واپس جانے سے روکے رکھتی ہے، کچھ وقت کے لئے۔ یہ رکاوٹ ہے، قید خانہ ہے۔ اگرچہ مومن کے دل میں اس زندگی کی واحد حقیقی جنت بسی ہوتی ہے، مگر روح اب بھی عالم ماورا کو جانا چاہتی ہے۔ روح اب بھی اپنے گھر کی متلاشی ہوتی ہے، لیکن اس روح کو ایک مخصوص وقت تک اس جسم کے زنداں میں قید رہنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ''قید کاٹنا'' ہوتی ہے، اس سے پہلے کہ اسے رہائی ملے اور وہ اپنے گھر جائے۔ مومن روح کی وابستگی اسے قید رکھنے والے جسم سے نہیں ہوتی۔ جب قید پوری ہو جاتی ہے اور قیدی کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر جا سکتا ہے تو وہ کبھی قید خانے کی سلاخوں کو پکڑ کے بیٹھ نہیں جائے گا۔ لہٰذا اللہ مومن کی موت کو نہایت مختلف انداز میں بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو بند کھول کر چھڑا دیتے ہیں۔''

(سورہ النازعٰت:۲)

مومن روح بڑی آسانی سے جسم سے نکل جاتی ہے۔ اس کی ''قید'' ختم ہو چکی ہے اور اب یہ اپنے گھر کو جا رہی ہے۔ وہ اس کافر روح کی طرح جسم سے چپکی نہیں رہتی جو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ وہ پہلے سے بہترین مقام کو پہنچ چکی ہے۔

اس لئے میرے ذہن میں اس سے بہتر اور کوئی تمثیل نہیں آتی جو کہ ہمارے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استعمال کی۔ یقیناً یہ زندگی مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت۔ ہم سب کو ایک ہی پکارنے والا واپس بلا لے گا۔ سوال یہ ہے کہ کہ ہم اپنی زندگی اس انداز میں گزاریں گے کہ جب یہ ندا آئے تو ہم قید خانے کی سلاخوں سے چپک کر بیٹھ جائیں یا اس انداز میں کہ یہ ندا ہماری رہائی کا پروانہ، ہماری گھر واپسی کی خبر ثابت ہو۔

خالق سے تعلق

نماز: زندگی کا فراموش کردہ مقصد

تاریخ کے ہر دور میں انسان نے بہت سے سفر کئے ہیں۔ لیکن ایک سفر ایسا ہے جو کسی نے نہیں کیا۔ کسی نے نہیں، سوائے ایک انسان کے۔

ایک ایسی سواری پر جس پر اور کوئی انسان نہیں بیٹھا، ایک ایسی راہ پر جو کسی اور انسان نے نہیں دیکھی۔ ایک ایسے مقام تک جہاں تک کسی مخلوق نے اس سے پہلے قدم نہ رکھا تھا۔ یہ ایک انسان کا خدا سے ملاقات کے لئے سفر تھا۔ یہ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سدرۃ المنتہیٰ تک سفر تھا۔

یہ الاسریٰ والمعراج تھا۔

اس سفر میں اللہ اپنے محبوب رسول کو ساتویں آسمان تک لے گیا، ایک ایسی جگہ جہاں جبریل علیہ السلام بھی داخل نہ ہو سکتے تھے۔ دنیا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کے حوالے سے ہر ہدایت، ہر حکم جبریل علیہ السلام کے ذریعے بھجوائی گئی۔ لیکن ایک حکم ایسا تھا جو اس وسیلے سے نہیں بھیجا گیا۔ ایک حکم تھا جو اتنا اہم تھا کہ جبریل علیہ السلام کے ہاتھوں اسے بھجوانے کے بجائے اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیا۔

وہ حکم نماز کا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلی مرتبہ نماز کا حکم دیا گیا، تو یہ دن بھر میں پچاس نمازوں کے لئے تھا۔ اللہ سے آسانی کی درخواست کرنے کے بعد، یہ حکم بتدریج گھٹا کر پانچ نمازوں تک محدود کر دیا گیا لیکن اس کا اجر وثواب پچاس نمازوں کے برابر ہی رکھا گیا۔

اس واقعے پر غور وفکر کرنے والے علماء وضاحت کرتے ہیں کہ نمازوں کی تعداد کو پچاس سے پانچ تک لانے کا عمل دانستاً انجام دیا گیا جس کا مقصد ہمیں یہ سمجھانا تھا کہ ہماری زندگی میں نماز کا حقیقی مقام کیا ہے۔ ایک لمحے کو تصور کیجئے کہ اگر سچ مچ دن میں پچاس نمازیں پڑھنا پڑ جاتیں تو کیا ہوتا؟ کیا ہم نماز پڑھنے کے علاوہ اور کوئی کام کر سکتے؟ نہیں۔ اور یہی نکتے کی بات

ہے۔ ہماری زندگی کے حقیقی مقصد کو واضح کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا تھا؟ گویا
کہ نماز ہی ہماری حقیقی زندگی ہے، باقی دن بھر کے سارے کام محض حرکات و سکنات ہیں۔

اور اس کے باوجود ہم یوں زندگی گزارتے ہیں جیسے صورت حال اس کے بکر الٹ
ہے۔ نماز ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ہم بمشکل گنجائش نکالتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب
ہمارے پاس وقت ہو۔ ہماری ''زندگیاں'' نماز کے گرد نہیں گھومتیں۔ نماز ہماری ''زندگیوں''
کے گرد گھومتی ہے۔ اگر ہم کلاس میں بیٹھے ہوں تو نماز ایک بعد میں آنے والا خیال بن جاتی
ہے۔ اگر ہم شاپنگ مال میں ہوں تو ''میسی'' کی سیل زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر ہم باسکٹ
بال کا ایک میچ دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے مقصد کو ہی پس پشت ڈال دیں تو کہیں نہ کہیں کوئی
بہت سنگین گڑبڑ موجود ہے۔

اور یہ بات بھی ان کے لئے ہے جو نماز پڑھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے
اپنی زندگی کے مقصد کو محض پس پشت ہی نہیں ڈالا بلکہ اسے سرے سے ہی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ نماز
چھوڑ دینے کے حوالے سے جس بات کا ہمیں اکثر احساس نہیں ہوتا، وہ یہ ہے: کسی عالم کا کبھی
یہ مؤقف نہیں رہا کہ زنا کا ارتکاب کرنے سے آپ کافر ہو جاتے ہیں۔ کسی عالم کا کبھی یہ مؤقف
نہیں رہا کہ چوری کرنے، شراب پینے یا منشیات استعمال کرنے سے آپ کافر ہو جاتے ہیں۔
کسی عالم نے کبھی یہ دعویٰ تک نہیں کیا کہ قتل کے مرتکب ہونے سے آپ غیر مسلم ہو جاتے
ہیں۔ لیکن نماز کے بارے میں چند علماء کا مؤقف ہے کہ جو اسے چھوڑ دے، وہ مسلمان نہیں
رہتا۔ اس مؤقف کی بنیاد اس حدیث پر رکھی گئی ہے:

''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے، اس لئے جو کوئی اسے چھوڑ
دیتا ہے، کافر ہو جاتا ہے۔'' (مسند احمد)

ایک ایسے عمل کا تصور کیجئے جو اتنا ناپسندیدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے
بارے میں اس انداز میں بات کریں۔ ایک لمحے کے لئے سوچئے کہ شیطان سے کسی غلطی کا
ارتکاب ہوا تھا۔ اس نے اللہ پر ایمان رکھنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک سجدہ کرنے سے
انکار کیا تھا۔ صرف ایک سجدہ۔ ذرا ان تمام سجود کے بارے میں سوچئے جنہیں کرنے سے ہم

انکار کرتے رہتے ہیں۔

ایسے انکار کی سنگینی کے بارے میں سوچیے۔ اور اس کے باوجود، ذرا سوچیے کہ نماز کے معاملے کو ہم کتنا ہلکا لیتے ہیں۔ روزِ محشر ہم سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا، اس کے باوجود ہمارے ذہن میں سب سے آخری جگہ اسے ملتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''روزِ قیامت انسان کے اعمال میں جس چیز پر سب سے پہلے فیصلہ دیا جائے گا، وہ نماز ہے۔ اگر یہ معاملہ درست ہوا تو وہ کامیاب و کامران رہے گا لیکن اگر یہاں خامی پائی گئی تو وہ ناکام ہو کر نامرادوں میں شامل ہو جائے گا۔'' (جامع ترمذی)

اس روز، جنتی جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ وہ یہاں کیوں پہنچے ہیں۔ اور قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا پہلا جواب کیا ہوگا:

''تمہیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا؟ وہ جواب دیں گے، ہم نمازی نہ تھے۔'' (سورۃ المدثر: ۴۳-۴۲)

ہم میں سے کتنے ہوں گے جن کا جواب ہوگا: ''ہم نمازی نہ تھے یا ہم نماز وقت پر ادا نہ کرتے تھے یا ہم ان لوگوں میں نہ تھے جو اپنی زندگیوں میں نماز کو ترجیح بناتے ہیں''؟ ایسا کیوں ہے کہ جب ہم کلاس میں بیٹھے ہوں یا کام کر رہے ہوں یا فجر کے وقت گہری نیند سوئے ہوں اور اس وقت ہمیں بیت الخلاء جانے کی حاجت محسوس ہو تو ہم اس کے لئے وقت نکال لیتے ہیں؟ درحقیقت، یہ سوال تقریباً بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال بھی ہمارے ذہن سے نہیں گزرتا کہ ہمارے پاس کچھ اور کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کا سب سے اہم امتحان دے رہے ہوں تو بھی اگر ہمیں بیت الخلاء جانے کی ضرورت پیش آ جائے تو ہم جائیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ نہ جانے کے خوفناک ممکنہ نتائج ہمارے پاس نہ جانے کا فیصلہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ کام کے دوران یا سکول کے وقت یا باہر گھومنے

پھرنے کے دوران ان کے پاس نماز کا وقت نہیں ہوتا۔ لیکن کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے کبھی کہا ہو کہ ان کے پاس بیت الخلاء جانے کا وقت نہیں ہوتا، اس لئے جب وہ گھوم پھر رہے ہوں، کام کر رہے ہوں یا سکول میں ہوں تو ''ڈائپر'' لگا لیتے ہیں؟ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنہیں اگر فجر کے وقت بیت الخلاء جانے کی حاجت محسوس ہو تو وہ بیدار نہ ہونے کا فیصلہ کریں اور اس کے بجائے اپنے بستر کو گیلا کرنے کو ترجیح دیں؟ سچ یہ ہے کہ ہم اپنے بستر سے اٹھیں گے یا کلاس سے نکلیں گے یا کام کرنا بند کر دیں گے، تاکہ بیت الخلاء استعمال کر سکیں، لیکن نماز کے لئے ایسا نہیں کریں گے۔

بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ہم اپنی جسمانی ضروریات کو اپنی روحانی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔ ہم اپنے اجسام کو غذا فراہم کرتے ہیں کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو مر جائیں گے۔ لیکن ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنی روحوں کو بھوکا مارتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اگر ہم نماز ادا نہ کریں تو ہماری روح مردہ ہو جائے گی۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ جس جسم کا ہم اتنا خیال رکھتے ہیں وہ محض عارضی ہے جبکہ ہماری روح، جسے ہم نظر انداز کئے رکھتے ہیں، ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

نماز اور بدترین چوری

صراطِ مستقیم ڈھونڈ لینے کے بعد واحد المیہ اس سے بھٹک جانا ہے۔ لغزشیں تو بہت سی ہیں لیکن اپنے دین کو کھو دینے سے زیادہ المناک لغزش اور کوئی نہیں۔ بعض اوقات یہ کوئی بہن ہوتی ہے جس نے اپنا حجاب اتار دینے اور ایک مختلف طرح کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا، بعض اوقات یہ کوئی بھائی ہوتا ہے جو ایک وقت میں کمیونٹی میں بہت سرگرم تھا لیکن پھر غلط صحبت میں پڑ گیا۔ لیکن ہر کہانی کے ساتھ، کسی طرح، راستے میں کسی مقام پر، ہمارے بھائی اور بہنیں گرتے چلے آئے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ کہانیاں عام ہیں۔ بعض اوقات ہم نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں: کیسے؟ کیوں؟ ہم حیران ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کوئی نیک آدمی راہ سے بھٹک کر اتنی دور کیسے نکل گیا۔

اس بارے میں سوچتے ہوئے اکثر ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ شاید جواب ہماری سوچ سے زیادہ سادہ ہے۔ لوگ ہر طرح کے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ایک گناہ ایسا ہے جو ان میں سے بہت سے لوگوں میں مشترک نظر آتا ہے۔ گناہ بھری زندگی گزارنے والوں میں زیادہ تر ایک قدر مشترک نظر آتی ہے۔ خواہ وہ فرد کبھی سیدھی راہ پر تھا اور پھر بھٹک گیا، خواہ اس نے کبھی صراطِ مستقیم پر قدم ہی نہیں رکھا، ایک بات کا امکان قوی ہے۔ بھٹکنے سے پہلے اس انسان کو نماز کو چھوڑنا پڑتا ہے، اس کی اہمیت گھٹانا پڑتی ہے، اسے پس پشت ڈالنا پڑتا ہے یا نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی نماز پڑھتا ہو مگر اس کے باوجود گناہوں سے آلودہ زندگی گزار رہا ہو تو قوی امکان اس بات کا ہے کہ اس کی نماز محض اعضاء کی حرکات وسکنات تک محدود ہے، اس کے دل یا روح میں نہیں اتری۔ دیکھیے، نماز کی ایک نہایت اہم خصوصیت ہے جسے اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اپنے خالق کے ساتھ ایک مقدس ملاقات ہونے کے علاوہ، نماز ایک نہایت حقیقی حفاظتی آڑ بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''اے محبوب پڑھیے، وہ کتاب جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے، اور نماز قائم کیجیے کہ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے، اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے، اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''
>
> (سورہ العنکبوت: ۴۵)

جب کوئی نماز کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس حفاظتی ڈھال کو بھی چھوڑ رہا ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ نماز کو چھوڑنے کا کام اکثر اچانک نہیں ہوتا بلکہ مرحلہ وار ہوتا ہے۔ آغاز میں نماز مقررہ اوقات سے تاخیر کر کے پڑھی جاتی ہے اور ایک نماز کو دوسری سے ملایا جانے لگتا ہے۔ جلد ہی یہ عمل نماز کو یکسر چھوڑ دینے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آپ کو پتہ بھی نہیں لگتا اور نماز نہ پڑھنا آپ کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے۔

اس دوران ایک اور کام بھی ہو رہا ہوتا ہے جو نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ ہر مؤخر کی گئی یا چھوڑی گئی نماز کے ساتھ ایک باطنی جنگ جاری ہوتی ہے یعنی شیطان کی جنگ۔ نماز چھوڑ کر

انسان نے وہ ڈھال نیچے رکھ دی ہے جو اللہ نے اسے دی تھی، اور حفاظتی بندوبست کیے بغیر میدانِ جنگ میں اتر آیا ہے۔ اب شیطان کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ اس صداقت کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور جو شخص رحمٰن کی یاد سے غفلت کرے، ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔'' (سورہ الزخرف: ۳۶)

اس لئے یہ جان کر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ نماز کے بارے میں غفلت برتنا ایک اسفل زندگی کی طرف جانے والی راہ پر پہلا قدم ہے۔ جو راہ سے بھٹک گئے ہیں، انہیں پلٹ کر صرف اتنا دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آغاز کہاں سے ہوا تھا، اور وہ جان جائیں گے کہ آغاز نماز کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا الٹ بھی بالکل درست ہے۔ جو اپنی زندگیوں کا رخ بدلنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس کا آغاز نماز پر توجہ مرکوز کرنے اور اسے کامل بنانے سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جب آپ نماز کو دوبارہ اپنی ترجیح بنا لیتے ہیں، سکول، کام، سیر و تفریح، سماجی مصروفیات، خریداری، ٹی وی، کھیل کود پر اسے مقدم رکھ لیتے ہیں، تب ہی ممکن ہو پاتا ہے کہ آپ اپنی زندگی کا رخ بدل سکیں۔

اس صداقت کے حوالے سے ستم ظریفانہ بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس مغالطے کے شکار ہو جاتے ہیں کہ نماز پڑھنے کا آغاز کرنے سے پہلے انہیں اپنی زندگی کا رخ بدلنا چاہئے۔ یہ سوچ شیطان کا ایک خطرناک حربہ ہے، جو جانتا ہے کہ اس انسان کو نماز کی بدولت ہی اپنی زندگی کا رخ بدلنے کے لئے درکار ایندھن اور ہدایت حاصل ہوگی۔ ایسے شخص کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہوتی ہے جس کی گاڑی کا فیول ٹینک خالی ہو لیکن وہ پٹرول بھروانے سے پہلے سفر مکمل کرنے پر اصرار کر رہا ہو۔ یہ شخص کہیں پہنچ نہیں پائے گا۔ اور اسی طرح، ایسے لوگ سالوں تک ایک ہی جگہ پر اٹکے رہتے ہیں، نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ اپنی زندگیاں بدلتے ہیں۔ شیطان نے انہیں چیلنج کیا اور کامیاب ہو گیا۔

ایسا کر کے ہم نے اسے اپنی وہ چیز چرانے کی اجازت دے دی جو انمول ہے۔ ہمارے گھر اور ہماری گاڑیاں ہمیں اتنی عزیز ہیں کہ ہم انہیں غیر محفوظ چھوڑنے کے بارے میں سوچنے

بھی نہیں۔ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے سکیورٹی انتظامات پر ہم بے شمار پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود ہمارا دین غیر محفوظ پڑا رہ جاتا ہے، تا کہ بدترین چور اسے اٹھا لے جائے......

ایک ایسا چور جس نے خود اللہ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ وہ قیامت تک ہمارا صریح دشمن بنا رہے گا۔ ایک ایسا چور جو محض مرسیڈیز کی علامت سے آراستہ کسی ڈھلی ہوئی دھات کو نہیں چرا رہا۔ ایک ایسا چور جو ہماری لازوال روح اور جنت میں داخلے کا جاودانی ٹکٹ چرا رہا ہے۔

ایک مقدس گفتگو

رات کی ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے جب پوری دنیا کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ دن کے وقت اکثر ہنگامے ہماری زندگیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ کام، سکول اور گھر کی ذمہ داریاں ہماری توجہ کے زیادہ تر حصے پر قابض ہو جاتی ہیں۔ روزانہ کی پانچ نمازوں کے لئے وقت نکالنے کے علاوہ، سوچ بچار کے لئے یا حتیٰ کہ ستانے کے لئے بھی وقت نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر اپنی زندگیاں اتنی تیز رفتار پر گزارتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں احساس بھی نہ ہو کہ ہم سے کیا کچھ چھوٹتا جا رہا ہے۔

تاہم، رات کا ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب کام ختم ہو جاتا ہے، ٹریفک سو جاتی ہے، اور خاموشی کی صدا کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اس وقت، جب ہمارے گرد و پیش کی ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے، ایک ہستی ایسی ہوتی ہے جو بیدار اور منتظر ہوتی ہے کہ ہم اسے پکاریں۔ حدیث قدسی میں ہمیں بتایا گیا ہے:

> ''ہر رات کے آخری تہائی حصے میں ہمارا رب اتر کر پہلے آسمان پر آ جاتا ہے اور کہتا ہے: ''کوئی ہے جو مجھے پکارے تا کہ میں اس کی آواز سنوں؟ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے تا کہ میں اسے عطا کروں؟ کوئی ہے جو میری مغفرت کا طلبگار ہو تا کہ میں اسے بخش دوں؟'' (بخاری و مسلم)

تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہماری چوکھٹ پر کوئی بادشاہ آ کر ہماری منہ مانگی چیز عطا کرنے کا وعدہ کرے تو کیا ہوگا۔ انسان سوچتا ہے کہ ہر ہوشمند شخص کم از کم ایسی ملاقات کے لئے کم از کم الارم ضرور لگا کر رکھے گا۔ اگر ہمیں بتایا جاتا کہ ہر صبح کی پہلی کرن سے ٹھیک ایک

گھنٹہ پہلے ایک کروڑ ڈال کر چیک ہماری دہلیز پر رکھ دیا جائے گا، تو کیا ہم اسے وصول کرنے کے لئے بیدار نہ ہوتے؟

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ رات کے اس پہر، پو پھٹنے سے عین پہلے، وہ اپنے بندوں کے پاس آئے گا۔ ذرا اس بارے میں تصور کیجئے۔ کائنات کے خالق و مالک نے ہمیں پیشکش کی ہے کہ اس کے ساتھ ایک مقدس گفتگو کریں۔ ہمارا رب منتظر ہوتا ہے کہ ہم آ کر اس سے بات کریں لیکن پھر بھی ہم میں سے بہت سے اسے انتظار کرتا چھوڑ دیتے ہیں اور خود سوئے رہتے ہیں۔ اللہ ہمارے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ ہم اس سے کیا چاہتے ہیں۔ زمین و آسمان کے خالق نے ہم سے کہا ہے کہ ہم جو مانگیں گے، وہ عطا کرے گا۔

اور پھر بھی ہم سوئے رہتے ہیں۔

ایک دن آئے گا جب دھوکے کا یہ پردہ ہماری نگاہوں سے ہٹ جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا لیکن ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا پس آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔'' (سورۂ قٓ: ۲۲)

اس روز ہمیں سچی حقیقت نظر آ جائے گی۔ اس روز ہمیں احساس ہوگا کہ نماز کی دو رکعتیں آسمان وزمین کی ہر چیز سے بڑھ کر تھیں۔ ہمیں اس انمول چیک کے بارے میں پتہ چلے گا جو ہر رات ہماری دہلیز پر رکھ دیا جاتا تھا جبکہ ہم سو رہے ہوتے تھے۔ ایک دن ایسا آئے گا جب ہم دنیا کی ہر چیز کو محض واپس آ کر دو رکعت نماز پڑھنے کے لئے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ایک دن ایسا آئے گا جب ہم ہر وہ چیز چھوڑ دیں گے جو اس زندگی میں ہمیں بہت عزیز تھی، ہر وہ چیز جو ہمارے قلوب و اذہان پر قابض رہی، ہر وہ سراب جس کے پیچھے ہم بھاگتے رہے، سب کچھ چھوڑ دیں گے تاکہ ہمیں اللہ کے ساتھ وہ گفتگو کرنے کا موقع مل سکے۔ لیکن اس روز کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کی طرف سے اللہ اپنا رخ پھیر لے گا...... اور انہیں فراموش کر دے گا، بالکل ویسے جیسے ایک وقت میں انہوں نے اسے فراموش کر دیا تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وہ کہے گا کہ الٰہی! مجھے تو نے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھتا بھالتا تھا۔ (جواب ملے گا کہ) اسی طرح ہونا چاہئے تھا، تو میری آئی ہوئی آیتوں کو بھول گیا تو آج تو بھی بھلا دیا جاتا ہے۔''

(سورۂ طٰہٰ: ۱۲۶۔۱۲۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''آج فریاد نہ کرو، بے شک ہماری طرف سے تمہاری مدد نہ ہوگی۔''

(سورہ المومنون: ۶۵)

کیا آپ ایک لمحے کے لئے تصور کر رہے ہیں کہ یہ آیاتِ مبارکہ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ ایسا نہیں جیسے آپ کو کسی پرانے دوست یا ہم جماعت کی طرف سے بھلا دیا جائے۔ یہ جہانوں کے مالک کی طرف سے بھلا دیا جانا ہے۔ جہنم کی آگ نہیں۔ ابلتا ہوا پانی نہیں۔ جھلسی ہوئی کھال نہیں۔ اس سے بڑی اور کوئی سزا نہیں۔

اور جیسے اس سے بڑی کوئی سزا نہیں، ویسے ہی اس سے بڑا کوئی انعام نہیں جس کا احوال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ ذیل حدیث میں بیان کیا ہے:

''جب جنت کے مستحق جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ ان سے دریافت کرے گا: کیا تمہیں مجھ سے اور بھی کچھ درکار ہے؟ وہ کہیں گے: کیا آپ نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور جہنم سے محفوظ نہیں کیا؟ اللہ پردہ اٹھا دے گا اور جو کچھ بھی انہیں عطا ہوا، ان میں سے کوئی چیز انہیں اپنے رب کے دیدار سے زیادہ عزیز نہ ہوگی۔'' (صحیح مسلم)

تاہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ اس شبینہ ملاقات کا نتیجہ جاننے کے لئے انسان کو روزِ قیامت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسے الفاظ ہی نہیں جن میں اس سکون و اطمینان کو بیان کیا جا سکے جو اس گفتگو کے بعد اسی زندگی میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا ادراک

اس تجربے سے گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ زندگی پر اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ جب آپ رات کے قیام کے تجربے سے گزرتے ہیں تو آپ کی بقیہ زندگی کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ اچانک جو بوجھ آپ کو کچلے ڈال رہے تھے، ہلکے ہو جاتے ہیں۔ لاینحل مسائل حل ہو جاتے ہیں، اور اپنے خالق کی قربت جو ایک وقت میں ناقابل رسائی تھی، آپ کی واحد رگِ جاں کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

تاریک ترین گھڑی اور طلوعِ صبح

ایک مشہور کہاوت کے مطابق، طلوعِ صبح سے پہلے رات کی سب سے تاریک گھڑی ہوتی ہے۔ اور اگرچہ علم فلکیات کی رو سے تاریک ترین وقت اس سے خاصا پہلے آتا ہے، اس کہاوت کی صداقت استعاراتی ہونے کے باوجود کسی اعتبار سے بھی کم حقیقی نہیں ہے۔

ان گنت مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگیوں کے تاریک ترین وقت کے بعد سب سے سہانا وقت آتا ہے۔ اکثر، جس وقت ہر چیز شکستہ نظر آتی ہے، اسی وقت کوئی بالکل غیر متوقع چیز ہمیں اٹھاتی ہے اور پار لے جاتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام سے ایک ایک کر کے ہر چیز چھن جانے کے بعد انہیں سب کچھ پہلے سے بڑھا کر لوٹا دیا گیا؟

ہاں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے رات حقیقی تھی۔ اور ہم میں سے بہت سوں کو ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمیشہ باقی رہے گی لیکن اللہ لامتناہی رات کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنے رحم و کرم کی بدولت، وہ ہمیں سورج عطا کرتا ہے۔ اس کے باوجود ایسے وقت آتے ہیں جب ہمیں لگتا ہے کہ ہماری مشکلات کبھی ختم نہیں ہوں گی، اور شاید ہم میں سے کچھ اپنے دین کے حوالے سے ایکی روحانی پستی کو پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے کہ خالق کے ساتھ ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور شاید ہم میں سے کچھ کے لئے، اندھیرا اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ہمارا اس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا۔

لیکن رات کے اختتام پر طلوع ہونے والے سورج کی طرح، ہماری صبح آ چکی ہے۔

اپنے لامتناہی رحم و کروم کی بدولت، اللہ نے رات کو مٹانے کے لئے رمضان کی روشنی بھیجی ہے۔ اس نے قرآن کا مہینہ نازل کیا ہے تاکہ وہ ہمیں بلند کرے اور ہمیں تنہائی سے نکال کر اپنی قربت

ے آشنا کرے۔ ہمارے خالی پن کو بھرنے کے لئے، ہماری تنہائی کا درماں کرنے کے لئے، اور ہماری روح کی عسرت ختم کرنے کے لئے اس نے یہ بابرکت مہینہ عطا کیا ہے۔اس نے مبع نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی تنہائی سے روشنی کشید کرسکیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وہی ہے جوتم پر رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے (تمہارے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں) تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے اجالے کی طرف لے جائے اور اللہ تعالیٰ مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے۔''

(سورۃ الاحزاب:۴۳)

اور یہ رحمت ان سب کے لئے ہے جو اس کے طلبگار ہیں۔ بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی کہا گیا ہے کہ وہ کبھی اپنے اللہ کی لامختتم رحمت سے مایوس نہ ہو۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''(میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش، بڑی رحمت والا ہے۔'' (سورۃ الزمر:۵۳)

اللہ رحمت کا مالک ہے، اور اس رحمت کی سب سے زیادہ برسات رمضان کے بابرکت مہینے میں ہوتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان کے متعلق فرمایا ہے:

''اس کی ابتدا رحمت ہے، اس کا وسط مغفرت ہے، اور اس کی اخیر جہنم سے آزادی ہے۔'' (ابن خزیمہ، الصحیح)

رمضان کا ہر مہینہ اللہ کی طرف لوٹ آنے کا ایک موقع ہے۔اس وقت اپنی زندگیوں میں ہم جس طرح کے حالات سے بھی گزر رہے ہیں، اکثر وہ ہمارے اعمال کا بلاواسطہ نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم شرمندگی کے شکار ہوتے ہیں یا خود کو پست محسوس کرتے ہیں تو ہمارے گناہوں نے ہی ہمیں پستی میں گرایا ہے۔ہم صرف اللہ سے ہی امید کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں پستی سے نکالے۔اگر ہم مسلسل فجر کے لئے اٹھنے میں ناکام رہتے ہیں، یا ہمیں حرام سے دور رہنا روز بروز مشکل معلوم ہوتا ہے، تو ہمیں اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا جائزہ لینا چاہئے۔سب

سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں کبھی خود کو یہ سوچنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے کہ اس دنیا کی کوئی چیز اللہ کے بغیر کامیاب ہوتی ہے، ناکام ہوتی ہے، دی جاتی ہے، لی جاتی ہے، تعمیر ہوتی ہے یا تباہ ہو جاتی ہے۔ اپنے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کی بدولت ہی ہم دنیا کے ساتھ، اور پوری بنی نوع انسان کے ساتھ، اپنے تعلق کے حوالے سے زندگی میں ابھرتے یا گرتے ہیں۔

لیکن بنی نوع انسان کے برعکس، ہمارا خالق بغض نہیں رکھتا۔ تصور کیجئے اگر آپ کا نامہ اعمال بالکل صاف کر دیا جائے۔ تصور کیجئے کہ اپنے اپنے جن اعمال پر آپ کو شرمندگی ہے، وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں۔ رمضان اس کا موقع ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا:

> ''جو کوئی رمضان میں روزے رکھتا ہے، ایمان کے اخلاص اور اللہ کا کرم حاصل کرنے کی امید کے ساتھ، تو اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔'' (صحیح بخاری)

تو یہ بے مثال موقع ملنے کے بعد، ہم اس سے بھرپور فائدہ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ دو نکات جو یاد رکھنے کے قابل ہیں مگر اکثر نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

☆ یہ جانئے کہ آپ روزہ کیوں رکھ رہے ہیں۔

بہت سے لوگ روزہ ایک رسم کے طور پر رکھتے ہیں اور اس کے مفہوم کو حقیقی معنوں میں سمجھ نہیں پاتے۔ دوسرے اسے محض غریبوں کے دکھ درد کا احساس پیدا کرنے کی ایک مشق سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ روزہ رکھنے کا ایک خوبصورت نتیجہ ہے، لیکن یہ وہ مرکزی مقصد نہیں جو اللہ نے بیان کیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

> ''روزے تم پر فرض کئے گئے، جیسا کہ تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔'' (سورۂ بقرہ: ۱۸۳)

اپنی جسمانی ضروریات کو کنٹرول کرنے اور احاطۂ ضبط میں لانے سے ہم زیادہ بڑی جنگ کے لئے قوت حاصل کرتے ہیں یعنی اپنے نفس کو کنٹرول کرنے اور احاطۂ ضبط میں لانے

کی جنگ۔ روزے کے دوران، بھوک کی ہر ٹیس ہمیں اللہ کی یاد دلاتی ہے جس کے لئے ہم نے یہ قربانی دی ہے۔ ہر وقت اللہ کو یاد رکھنے اور اس کے لئے قربانی دینے کی بدولت ہم اس کی موجودی کے بارے میں زیادہ باخبر ہو جاتے ہیں، اور اس طرح ہمارے تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی چیز جو ہمیں اس گناہ سے باز رکھتی ہے کہ دوسروں کی نگاہ بچا کر کچھ کھا پی لیں، ہمیں تربیت دیتی ہے کہ دوسروں کی نگاہ بچا کر گناہ کرنے سے باز رہیں۔ یہی تقویٰ ہے۔

☆ روزے کو محض بھوک پیاس نہ بنائیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''جو کوئی جھوٹ بولنا اور برے کام کرنا نہیں چھوڑتا، اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی حاجت نہیں۔'' (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں خبردار بھی کرتے ہیں:

''بہت سے لوگ جو روزہ رکھتے ہیں، انہیں اس سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور بہت سے لوگ جو رات کے وقت عبادت کرتے ہیں، انہیں اس سے شب بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (دارمی)

روزہ رکھتے وقت پوری بات کو سمجھئے۔ یاد رکھئے روزہ محض کھانے پینے سے دور رہنے کا نام نہیں۔ یہ خود کو ایک بہتر انسان بنانے کی جدوجہد کرنے کا نام ہے۔

اور اس جدوجہد کی بدولت ہمیں اللہ سے علیحدگی کی تاریکی سے نکلنے کا ایک موقع عطا کیا جاتا ہے۔ لیکن دن کے اختتام پر غروب ہو جانے والے سورج کی طرح، رمضان بھی آئے گا اور چلا جائے گا، اور دل کے آسمان پر محض اس کا نشان باقی رہ جائے گا۔

آج ہم نے ایک شخص کو دفن کیا: موت پر غور و فکر

یہ تحریر میں نے ایک نیک روح کی تدفین کے بعد گھر واپس آتے ہوئے اپنی کار میں لکھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پر اور اس کے گھر والوں پر رحمتیں نازل کرے۔ آمین!

آج ہم نے ایک شخص کو دفن کیا۔ اور اب میں زندوں کے کارواں میں شامل ہو کر گھر واپس آ رہی ہو۔ اس وقت کے لئے۔

اس وقت میں اور آپ زندوں کے کارواں میں شامل ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ ہمیں کسی اور دنیا کو جانا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جا رہے ہیں اور ہم نہیں جا رہے۔ صرف اس لئے کہ ہمارا کارواں پیچھے رہ گیا۔ اس وقت ہمیں اپنے گھروں، اپنی خوابگاہوں، اپنے ٹیلی ویژنز، اپنے سٹیریوز، اپنے کاموں، اپنے امتحانوں، اپنے دوستوں، اپنی فیس بک، اور اپنی ''جی چیٹ'' کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اس وقت ہم اپنی توجہ بھٹکانے والی چیزوں، اپنے بتوں، اپنے دھوکہ دینے والے واہموں کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ مگر بات صرف اتنی ہے۔ میں اپنی گھر، اپنی خواب گاہ، اپنے ٹی وی اور اپنے سٹیریو کی طرف واپس نہیں جا رہی۔ میں اپنی ملازمت، اپنے امتحانات، اپنے دوستوں، اپنی فیس بک اور جی چیٹ کی طرف واپس نہیں جا رہی۔ میں اپنی توجہ بھٹکانے والی چیزوں، اپنے واہموں اور بتوں کی طرف واپس نہیں جا رہی۔ میں اس طرف کو واپس جا رہی ہوں جہاں سے میرا آغاز ہوا تھا۔ میں اسی جگہ کو واپس جا رہی ہوں جہاں وہ شخص چلا گیا۔ میں اسی جگہ کی طرف جا رہی ہوں۔ بس مجھے اتنا علم نہیں کہ میری مسافت کتنی طویل ہوگی۔

میں اس طرف کو واپس جا رہی ہوں جہاں سے میرا آغاز ہوا تھا یعنی خدا کے پاس۔ کیونکہ خدا ہی ''الاول'' ہے اور خدا ہی ''الآخر'' ہے۔

میرا جسم مجھے وہاں لے جا رہا ہے لیکن یہ محض ایک سواری ہے۔ جب میں وہاں پہنچوں گی تو یہ پیچھے رہ جائے گا۔ جیسا کہ یہ آج رہ گیا۔ میرا جسم مٹی سے نکلا اور مٹی میں مل جائے گا۔ یہ محض ایک خول تھا، میری روح کے لئے ایک برتن۔ کچھ وقت کے لئے میرا ساتھی۔ لیکن جب میں اپنی منزل پر پہنچوں گی تو اسے یہاں چھوڑ جاؤں گی۔ پہنچوں گی ...... رخصت نہیں ہوں گی۔ کیونکہ وہی میرا گھر ہے۔ یہ دنیا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نیک روح کو واپس بلا رہا ہے۔ اس کا فرمان ہے: ''تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل۔'' (سورہ الفجر: ۲۸)

جس خوبصورت، نیک انسان کو ہم نے آج دفن کیا، وہ زندگی سے رخصت نہیں ہوا۔''

محض ایک ارفع تر...... اور انشاء اللہ...... بہتر سطح کو پہنچ گیا۔ وہ محض اپنے گھر کو پہنچ گیا۔ مگر جسم مادی دنیا سے بنا تھا، اس لئے اسے یہاں چھوڑنا پڑا۔ جسم اسفل دنیا سے تعلق رکھتا ہے، وہ دنیا جہاں ہمیں کھانے اور سونے اور خون گرانے اور آنسو بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور مرنے کی۔ لیکن روح کا تعلق ارفع دنیا سے ہے۔ روح کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے: اللہ کے تقرب کی۔

اور لہٰذا جہاں مادی دنیا کا جسم روتا ہے اور خون بہاتا ہے اور درد محسوس کرتا ہے، روح ان تمام چیزوں سے محفوظ رہتی ہے۔ روح کو زخم لگانے، چوٹ پہنچانے یا تکلیف دینے کا کام صرف ایک چیز کر سکتی ہے۔ صرف ایک چیز ایسی ہے جو اسے قتل کر سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اُسے اس کی اکلوتی ضرورت سے محروم کر دیا جائے یعنی اسے اپنے خالق سے دور کر دیا جائے۔ اور اس لئے ہمیں اس انسان کے لئے آنسو نہیں بہانا چاہئیں جو اپنے گھر کو پہنچ گیا...... وہ مرا نہیں۔ اس کے بجائے ہمیں اس کے لئے رونا چاہئے جس کا جسم زندہ ہے لیکن اس کی روح مر چکی ہے کیونکہ وہ اس ہستی سے بیگانہ ہو گئی جس نے اسے زندگی دی تھی یعنی اپنے رب سے۔

اور لہٰذا مومن روح بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی طرف جاتی ہے، اس وقت بھی جب وہ اس دنیا میں ہوتی ہے۔

اے میرے رب، میری روح کو میرے باطن میں ایک پناہ گاہ، ایک قلعہ بنا دے، جسے کوئی ضرر نہ پہنچا سکے۔ سکون، سکوت اور اطمینان کی ایک جگہ، جو باہر کی دنیا سے محفوظ ہو۔ وہ روح جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''نفس مطمئنہ'' (الفجر: ۲۷) کا نام دیتا ہے۔ وہ روح جسے اللہ یہ کہتے ہوئے واپس بلاتا ہے:

> ''اے اطمینان والی روح۔ تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں چلی جا۔'' (سورہ الفجر: ۳۰۔۲۷)

میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں؟

سوال: میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں؟

جواب: ایسا ایماندارانہ سوال پوچھنے پر اللہ آپ کو اجر عطا کرے، اور حقانیت کی طرف آپ کی رہنمائی کرے۔ آمین۔

میرے خیال میں ایسی صورتِ حال میں یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے اسباب اور اپنے مقاصد کو خلط ملط کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب ہم ایک اچھے شوہر کے لئے دعا کرتے ہیں، تو یہ مضبوط رشتہ ازدواج ایک ذریعہ ہے یا ایک مقصد؟ میرے خیال میں بہت سے لوگ اسے ایک مقصد کے طور پر لیتے ہیں، جس سے ان بہت سے مغالطوں اور مایوسیوں کی وجہ سمجھ آ جاتی ہے جو اکثر بعد ازاں پیدا ہوتے ہیں (ستم ظریفانہ طور پر دونوں صورتوں میں: ہماری دعا قبول ہو تب بھی، اور قبول نہ ہو تب بھی)۔ اس دنیا کی ہر چیز کی طرح، شادی بھی محض ایک ذریعہ ہے...... اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ۔ اس لئے اگر ہم اس کے لئے دعا کریں اور یہ ہمیں نہ ملے، تو شاید اللہ نے ہمارے لئے کوئی اور ذریعہ چن رکھا ہے...... شاید مشکلات کے ذریعے، ان کی بدولت ہونے والے تزکئے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے صبر کے ذریعے، ہمیں مقصد تک پہنچایا جائے گا یعنی اللہ تک۔ اللہ سب سے بہتر جانتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ہمیں ہماری دعا کے مطابق ایک اچھا شوہر عطا کر دیتا تو ہم غفلت میں پڑ جاتے اور اس طرح اپنا مقصد بالکل ہی حاصل نہ کر پاتے۔

تاہم، میرے خیال میں مسئلہ یہ ہے کہ اسے اس انداز میں دیکھنے کے بجائے، ہم چیزوں کو بالکل الٹ انداز میں دیکھ رہے ہیں۔ دنیا (اچھی ملازمت، خاص قسم کا جیون ساتھی، اولاد، سکول، کریئر وغیرہ) ہمارا مقصد ہے اور اللہ اس مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ۔ دعا کر کے ہم اپنے مقصد (جس چیز کے لئے بھی ہم دعا کر رہے ہوں) تک پہنچنے کے لئے اس ذریعے کو استعمال کرتے ہیں، اور جب ہمارا ذریعہ (اللہ) ہمارے کام نہیں آتا تو ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہم ہاتھ جھٹکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہو رہیں۔ ہمارا ذریعہ، ہمارا وسیلہ ہمارے کام نہیں آ رہا!

لیکن اللہ وسیلہ نہیں ہے۔ وہ مقصد ہے۔ خود دعا کا حتمی مقصد بھی خدا کے ساتھ ہمارا تعلق استوار کرنا ہے۔ دعا کے ذریعے ہم اس کی قربت حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا، میرے خیال میں

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا فوکس غلط جگہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دعائے استخارہ بہت پسند ہے۔ یہ بالکل کامل دعا ہے کیونکہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ صرف اللہ ہی سب سے بہتر جانتا ہے، اور پھر اسی سے دعا کی جاتی ہے کہ ہمیں وہ عطا کرے جو ہمارے لئے بہترین ہے اور وہ ہم سے دور کر دے جو ہمارے لئے بہترین نہیں ہے۔ اس دعا کا فوکس صرف اس چیز پر نہیں ہوتا جو آپ مانگ رہے ہیں۔ فوکس اس چیز پر ہوتا ہے جو اس زندگی اور اخروی زندگی کے لئے بہترین ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی مطلوبہ اشیاء کے لئے خصوصیت سے دعا نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس، اللہ کو یہ بات بہت پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ مانگ لینے کے بعد، ہم اپنے حصے کا کام بہ تمام و کمال انجام دیتے ہیں، اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں، تو پھر اللہ ہمارے لئے جو چیز بھی منتخب کرتا ہے، اس پر ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اللہ ہر دعا قبول کرتا ہے...... مگر ہمیشہ اس انداز میں نہیں جس کی کہ ہمیں توقع ہوتی ہے۔ اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم محدود ہے، اور اللہ کا علم لامحدود۔ اپنے لامحدود علم کی بدولت وہ ہمیں وہ چیز عطا کر سکتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ یہ چیز ہمارے حتمی مقصد یعنی اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے بہتر ثابت ہوگی۔

واللہ اعلم!

فیس بک: پوشیدہ خطرہ

ہم ایک ''آئی ورلڈ'' میں زندہ ہیں۔ ہمارے چاروں طرف آئی فون، آئی پیڈ، مائی سپیس، یوٹیوب بکھرے ہوئے ہیں، لہٰذا فوکس واضح ہے: میں، میں اور میں۔ نفس کے حوالے سے اس خبط کو ملاحظہ کرنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنی چیز بیچنے کے لئے، اشتہار بازوں کو آپ کی انا کو سہلانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، کئی اشتہار ہمارے اس حصے کو متاثر کرتے ہیں جسے طاقت اور اختیار بہت پسند ہوتا ہے۔ ''ڈائریکٹ ٹی وی'' آپ کو بتاتا ہے: ''ٹی وی مت دیکھئے، ٹی وی کو ''ڈائریکٹ'' کیجئے۔'' (یعنی اپنی مرضی کے مطابق چلائیے۔ مترجم) ''یوگرٹ لینڈ'' کا کہنا ہے: ''آپ کی حکمرانی ہے! دہی کے لامتناہی امکانات کی سرزمین میں خوش آمدید، جہاں مقداروں، انتخابوں اور منظر پر آپ کی حکمرانی ہے۔''

لیکن صرف اشتہار باز ہی ہماری انا کو سہلانے کا کام نہیں کرتے۔ ایک عالمی مظہر ہے جو اس انا کے پھلنے پھولنے کے لئے جگہ اور پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ اور اس کا نام فیس بک ہے۔ اب، میں سب سے پہلے یہ تسلیم کروں گی کہ فیس بک خیر کے لئے ایک طاقتور آلہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کئی دوسری چیزوں کی طرح، یہ بھی ویسی ہی ہے جیسا کہ اس کا استعمال کیا جائے۔ چاقو کو، خوراک کاٹنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے کسی بھوکے کا پیٹ بھرے، اور اسے کسی کو قتل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فیس بک کو خیر کثیر کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے...... آخر یہ فیس بک ہی تو تھی جس نے ایک آمر کا تختہ الٹانے میں اعانت کی۔ تنظیم سازی کرنے، صدا بلند کرنے، یاد دہانی کرانے اور متحد کرنے کے لئے فیس بک کو ایک زبردست آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فیس بک کو اللہ کے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے...... یا فیس بک کو اپنے نفس کی گرفت مضبوط کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

فیس بک ایک دلچسپ مظہر ہے۔ انا ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ ہماری ذات کا وہ حصہ ہے جسے دبایا جانا چاہئے (اگر ہمیں سٹار وارز کے اینا کن کی طرح بدی کا آلہ کار نہیں بننا تو......)۔ انا کی پرورش کرنے میں یہ خطرہ پوشیدہ ہے کہ جوں جوں اس کا پیٹ بھرتا ہے، یہ طاقتور ہوتی جاتی ہے۔ جب یہ طاقتور ہو جاتی ہے تو یہ ہم پر حکمرانی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جلد ہی وہ وقت آتا ہے جب ہم اللہ کے بندے نہیں رہتے...... ہم اپنے نفس کے بندے بن جاتے ہیں۔

انا ہماری ذات کا وہ حصہ ہے جسے طاقت بہت پسند ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو دکھائی دینا، پہچانے جانا، سراہے جانا، اور چاہے جانا بہت پسند کرتا ہے۔ فیس بک اس کے لئے ایک جاندار پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے میرا ہر لفظ، تصویر یا خیال دیکھا جا سکتا ہے، سراہا جا سکتا ہے، اور "لائیک" کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، میں اس کی طلب گار رہنے لگتی ہوں۔ مگر پھر بات صرف سائبر دنیا تک محدود نہیں رہتی، میں اپنی زندگی کو بھی یہی چیز ذہن میں رکھ کر جینے لگتی ہوں کہ مجھے دیکھا جا رہا ہے۔ اچانک، میں

ہر تجربے، ہر فوٹو، ہر خیال کو یوں جیتی ہوں، جیسے اسے دیکھا جا رہا ہے، کیونکہ میرے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں یہ خیال جاگزیں ہے: ''میں اسے فیس بک پر ڈالوں گی۔'' اس طرح ہست و بود کی ایک نہایت دلچسپ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، تقریباً ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ میری زندگی کی نمائش ہو رہی ہے۔ دیکھے جانے کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ ہر چیز کو فیس بک پر ڈالا جا سکتا ہے تاکہ دوسرے اسے دیکھیں اور ''کمنٹ'' کریں۔

زیادہ اہم بات یہ کہ، اس سے اہمیت بخود کا جھوٹا احساس پیدا ہوتا ہے، جس کے تحت میرا کیا ہوا ہر غیر اہم کام بھی بین الاقوامی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ جلد ہی میں فوکس بن جاتی ہے، وہ جسے نمائش پر لگایا گیا ہے۔ پیغام یہ ہے: میں بہت اہم ہوں۔ میری زندگی بہت اہم ہے۔ میرا کیا ہوا ہر کام بہت اہم ہے۔ نتیجہ ایک پہلے سے بھی زیادہ طاقتور، مجھ پر مرکوز، دنیا کی شکل میں سامنے آتا ہے، جس کا مرکز و محور میں ہوں۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ نتیجہ ہست و بود کی حقیقت کے یکسر الٹ ہے۔ اس زندگی کا مقصد خدا کی کبریائی کی صداقت، اور اس کے سامنے میری اپنی عدم اہمیت اور ضرورت کا احساس کرنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ میں خود کو مرکز سے ہٹاؤں اور اپنی جگہ اللہ کو مرکز میں رکھوں۔ لیکن فیس بک اس کے یکسر الٹ واہمے کو دوام بخشتی ہے۔ یہ میری اس سوچ کو تقویت دیتی ہے، کہ میری اپنی اہمیت کی وجہ سے، میری ہر غیر اہم حرکت یا خیال کی نمائش لگائی جانی چاہئے۔ یکایک یہ بھی ایک خبر بن جاتی ہے کہ میں نے ناشتے میں کیا کھایا یا کریانے کی دکان سے کیا خریدا، اتنی اہم خبر کہ اس کا شائع کئے جانا ضروری ہے۔ جب میں ایک تصویر پوسٹ کرتی ہوں تو ستائشی کلمات کی منتظر رہتی ہوں۔ میں نام و نمود کی منتظر رہتی ہوں۔ ''لائیکس'' یا ''کمنٹس'' کی تعداد کے تحت، جسمانی حسن ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جس کی مقدار معلوم کی جا سکتی ہے۔ جب میں ایک پوسٹ لگاتی ہوں تو اس کے ''لائیک'' کئے جانے کی منتظر رہتی ہوں۔ اور اپنے ''فرینڈز'' کی تعداد کا مجھے ہمیشہ احساس رہتا ہے بلکہ اس حوالے سے میں مقابلے بازی بھی کرتی ہوں۔ (یہاں فرینڈز کو واوین معکوس میں اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اپنے فیس بک ''فرینڈز'' کی 80 فیصد تعداد کو تو لوگ اصل زندگی میں جانتے تک نہیں ہوتے۔)

مزید حاصل کرنے کی اس مشغولیت اور رقابت کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کثرت کی چاہت نے تمہیں غافل کر دیا۔'' (سورۃ التکاثر: ۱)

خواہ یہ رقابت دولت جمع کرنے کے حوالے سے ہو یا فیس بک پر فرینڈز اور ''لائیکس'' حاصل کرنے کے حوالے سے، نتیجہ ایک ہی ہے: ہم اس کی بدولت غافل ہو گئے ہیں۔

فیس بک ایک اور خطرناک فوکس کو بھی تقویت دیتی ہے: دوسرے لوگوں پر فوکس، وہ کیا کر رہے ہیں، وہ کیا پسند کرتے ہیں۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ فیس بک میرے بارے میں دوسروں کی رائے کے ذریعے اس مشغولیت، اس غفلت کو توانا کرتی ہے۔ جلد ہی میں مخلوق کے مدار میں داخل ہو جاتی ہوں۔ اس مدار میں رہتے ہوئے، میری تعاریف، میرا درد، میری خوشی، میری خود توقیری، میری کامیابی اور میری ناکامی کا تعین مخلوق سے ہوتا ہے۔ اس مدار کے اندر رہتے ہوئے میرا عروج و زوال مخلوق سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب لوگ مجھ سے خوش ہوتے ہیں تو میں عروج پر ہوتی ہوں۔ جب وہ خوش نہیں ہوتے تو مجھے زوال آ جاتا ہے۔ لوگ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ میں کہاں کھڑی ہوں۔ میری حیثیت ایک قیدی کی سے ہے کیونکہ میں نے اپنی خوشی، دُکھ، اطمینان اور مایوسی کی چابیاں دوسروں کے حوالے کر دی ہیں۔

ایک بار جب میں خالق کے بجائے مخلوق کے مدار میں داخل ہو کر وہاں رہنے لگتی ہوں، تو میں یہ کرنسی استعمال کرنے لگتی ہوں۔ دیکھئے، خدا کے مدار کی کرنسی یہ ہے: اس کی خوشنودی یا اس کی ناراضی، اس کا انعام یا اس کی سزا۔ لیکن مخلوق کے مدار کی کرنسی یہ ہے: لوگوں کی تعریف یا تنقید۔ لہٰذا میں اس مدار میں جتنا گہرا اترتی ہوں، اس کرنسی کے لئے میری حرص اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے، اور میں اس سے محروم ہونے سے اتنا ہی ڈرنے لگتی ہوں۔ مثال کے طور پر، اگر میں ''مناپلی'' (Monopoly) کھیل رہی ہوتی ہوں، تو مجھے اس کی کرنسی کی زیادہ سے زیادہ طمع ہوتی ہے۔ اور ایک لمحے کے لئے ''دولتمند'' ہو جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو حقیقی دنیا میں مناپلی کی کرنسی سے میں کیا خرید سکتی ہوں؟

تعریف کی انسانی کرنسی کی حیثیت بھی مناپلی کی دولت کی سی ہے۔ ایک لمحے کے لئے

اس کا جمع کرنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو یہ بے وقعت ہو جاتی ہے۔ اس زندگی اور اُخروی زندگی کی حقیقت میں یہ بے وقعت ہے۔ اور اس کے باوجود، میں اپنی عبادات میں بھی اس جعلی کرنسی کی طمع کرتی ہوں۔ اس طرح سے میں پوشیدہ شرک کی شکار ہو جاتی ہوں یعنی ریا۔ ریا مخلوق کے مدار میں زندگی گزارنے کا نتیجہ ہے۔ میں اس مدار کی گہرائی میں جتنا زیادہ اترتی ہوں، انسانی تعریف، پسندیدگی اور شہرت حاصل کرنے کی طمع اتنی ہی غالب آتی جاتی ہے۔ میں اس مدار کے جتنا زیادہ اندر گھستی ہوں، محرومی کا خوف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ ساکھ سے محرومی، مرتبے سے محرومی، تعریف سے محرومی، پسندیدگی سے محرومی۔

لیکن میں لوگوں سے جتنا زیادہ ڈرتی ہوں، میری غلامی کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقی آزادی اسی وقت ملتی ہے جب میں اللہ کے سوا ہر چیز اور ہر انسان کے خوف سے چھٹکارا پا لیتی ہوں۔

ایک نہایت گہرے مفہوم کی حامل حدیث میں ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور بولا: ''یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جسے کرنے سے خدا بھی مجھ سے راضی ہو جائے اور بندے بھی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خود کو دنیا سے لاتعلق کر لو تو اللہ تم سے راضی ہو جائے گا۔ لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہے، خود کو اس سے لاتعلق کر لو تو لوگ تم سے راضی ہو جائیں گے۔'' (ابن ماجہ)

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم لوگوں کی پسندیدگی اور محبت کی جتنی کم طلب کرتے ہیں، یہ ہمیں اتنی ہی زیادہ حاصل ہوتی ہیں۔ ہمیں دوسروں کی ضرورت جتنی کم محسوس ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ لوگ ہماری طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور ہماری صحبت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ یہ حدیث ہمیں ایک عمیق صداقت سے روشناس کراتی ہے۔ مخلوق کے مدار سے نکل کر ہی ہم خدا اور لوگوں، دونوں کے سامنے سرخرو ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا فیس بک اگرچہ ایک طاقتور آلہ ہے، مگر اسے آزادی کا آلہ رہنے دیجئے..... اپنے نفس اور دوسروں کی رائے کی غلامی کا آلہ نہ بنایئے۔

یہ بیداری ہے

اس احساس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ نے ساری عمر ایک غار میں گزاری ہو اور یہ سمجھتے رہے ہوں کہ یہی آپ کی کل دنیا ہے۔ پھر اچانک آپ باہر قدم رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ آپ آسمان کو دیکھتے ہیں۔ آپ درختوں اور پرندوں اور سورج کو دیکھتے ہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ آپ کو احساس ہوتا ہے کہ جس دنیا سے آپ کبھی واقف تھے، وہ نقلی تھی۔ پہلی مرتبہ آپ ایک زیادہ سچی، زیادہ خوبصورت حقیقت دریافت کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ یہ احساس آپ پر کیسی سرمستی طاری کر دے گا۔ ایک لمحے، آپ کو ایسا لگتا ہے کہ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اچانک، غار میں گزاری ہوئی گزشتہ زندگی کی کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ پہلی مرتبہ آپ صاحب اختیار ہو جاتے ہیں، پوری طرح بیدار، پوری طرح زندہ، پوری طرح باخبر ہو جاتے ہیں۔ اس احساس کی تشریح کرنا ناممکن ہے۔ یہ وہ روحانی سرمستی ہے جو صداقت کو پہلی مرتبہ دریافت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

یہ بیداری ہے۔

اسلام قبول کرنے والا اس احساس سے واقف ہے۔ ایک پیدائشی مسلمان جو دین کی طرف لوٹ آتا ہے، وہ اس احساس سے واقف ہے۔ کوئی بھی انسان جو اپنی زندگی اللہ سے دور رہ کر گزارنے کے بعد لوٹ آتا ہے، اس احساس کو جانتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے ابن القیم اپنی کتاب ''مدارج السالکین'' میں ''یقظا'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس کیفیت کو راہِ سلوک میں پہلی منزل قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے بعض اوقات ''نو مسلم کا جوش'' کا نام دیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص پہلے پہل اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے یا اللہ کی طرف واپس آنے لگتا ہے تو اکثر وہ ایسے جوش وخروش اور توانائی سے بھرپور نظر آتا ہے جو دوسروں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس توانائی کی وجہ وہی روحانی سرمستی ہوتی ہے جو اس کیفیت کا خاصہ ہے۔

بیداری کی منزل کی خصوصیات:

☆ اللہ عبادت کو آسان بنا دیتا ہے۔

اس کیفیت میں عبادت کرنا کہیں زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ انسان میں ایسا ذوق وشوق

اور تحرک ہوتا ہے کہ وہ اس نو دریافت شدہ حقیقت کی خاطر سب کچھ قربان کرنے پر بڑی آسانی سے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ جوش وخروش ایک انسان کو زیرو سے 60 تک پلک جھپکتے لے جا سکتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے روحانی سٹیرائڈز استعمال کر لئے گئے ہوں۔ جو قوت آپ میں آتی ہے، وہ آپ کی ذات سے نہیں پھوٹتی بلکہ آپ کو ملنے والی اعانت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں یہ اعانت اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ مشورہ دیں کہ بہت تیزی سے بہت کچھ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں تیز رفتار تبدیلی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں تکبر مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں ناامیدی مسئلہ ہے۔ اگر اللہ آپ کو ایسی صلاحیت عطا کرتا ہے جس کی بدولت آپ زیادہ کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو اسے استعمال کیجئے۔ مگر اس اہلیت کے لئے اللہ کے ممنونِ احسان بنئے، اپنی ذات کے نہیں۔ اور جان لیجئے کہ سرمستی کا یہ عالم عارضی ہے۔ اس کی بدولت آپ بہت مختصر وقت میں زیرو سے 60 تک پہنچ سکتے ہیں لیکن جب یہ عالم گزر جائے گا تو مایوسی کے شکار ہو کر واپس زیرو پر آ جانے کی ضرورت نہیں۔

☆عارضی

اس زندگی کی ہر کیفیت کی طرح، یہ کیفیت بھی عارضی ہے۔ زندگی کبھی خط مستقیم میں نہیں چلتی، اور نہ ہی اللہ کی طرح جانے والا راستہ سیدھی لکیر کی طرح ہوتا ہے۔ اس بات سے بے خبری رہنے کی صورت میں اس کیفیت کے گزر جانے کے بعد، آپ مایوسی و ناامیدی کے شکار ہو سکتے ہیں۔

اس کیفیت کے چور گڑھے:

اس کیفیت کے ساتھ جو دو چور گڑھے منسوب کئے جاتے ہیں، ان کا تعلق اس کیفیت کی مندرجہ بالا خصوصیات کو سمجھ نہ پانے سے ہے۔ یہ چور گڑھے راہ سلوک میں جمود کے شکار ہو جانے کے دو اسباب بھی ہیں یعنی تکبر/ اطمینان اور مایوسی۔ متکبر انسان سمجھتا ہے کہ میں پہلے ہی بہت اچھا ہوں، اس لئے وہ جدوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ مایوس انسان سمجھتا ہے کہ وہ کبھی کچھ کر ہی نہیں پائے گا، اس لئے وہ بھی جدوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ دو متضاد امراض ایک ہی نتیجہ دیتے ہیں یعنی آپ کو راہ سلوک پر آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔

☆ تکبر

پہلے چور گڑھے کا تعلق اس بات کو نہ سمجھ پانے سے ہے کہ عبادت کی بڑھی ہوئی صلاحیت اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ اس کیفیت کا خاصہ ہے، فرد کا نہیں۔ جو اس بات کو سمجھ نہیں پاتا، وہ مغالطے کا شکار ہوتے ہوئے اس کیفیت سے ملنے والی عبادت کی صلاحیت کو اپنی راست بازی سے منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ جھوٹا انتساب بہت خطرناک ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تکبر اور پارسائی کا زعم پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس کرنے کے بجائے یہ اضافہ اللہ کی طرف سے ایک انعام ہے، عابد ڈھکے چھپے فخر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ممکن ہے، ان لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے جو اس طرح کے جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔

☆ مایوسی و ناامیدی

اس چور گڑھے کا تعلق اس بات کو نہ سمجھ پانے سے ہے کہ اس زندگی کی تمام کیفیات کی طرح، روحانی سرمستی کی یہ کیفیت بھی عارضی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ناکام ہو گئے ہیں یا یہ کہ آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ زیادہ تر لوگ جانتے ہیں کہ رمضان کی سرمستی گزر جانے کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس سرمستی کی تغیر پذیری زندگی کی ایک خصوصیت ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو حضرت ابوبکرؓ صدیق کو بھی سیکھنا پڑا۔ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت حنظلہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت کے باغوں اور جہنم کی آگ کی یاد دلاتے ہیں اور ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم آپ کی صحبت سے اٹھ کر جاتے ہیں تو اپنے بیوی بچوں اور دنیاوی معاملات میں مشغول ہو کر غافل ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم پر وہی کیفیت طاری رہے جو میری صحبت میں اور ذکر کے دوران ہوتی ہے، تو فرشتے تمہارے بستر پر آ کر اور راستے میں تمہیں روک کر تم سے مصافحہ کریں، لیکن حنظلہؓ، مختلف وقت ایک سے نہیں ہوتے۔'' آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔ (صحیح مسلم)

روحانی سرمستی کی کیفیت گزر جانے کے بعد:

اس سفر کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ کبھی کوشش ترک نہ کی جائے۔ جان لیجئے کہ آپ کو پہلے جیسا جوش و خروش محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں آپ کسی چیز میں ناکام ہو گئے ہیں۔ فراز کے بعد اس نشیب کا آنا اس راہ کا فطری حصہ ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو بتایا، یہ نشیب و فراز اس سفر کا حصہ ہیں۔ اور اگر ہم ہمیشہ سرمستی کی کیفیت میں ہی رہیں تو ہم انسان نہ رہیں گے۔ ہم فرشتے بن جائیں گے! کامیابی کا فیصلہ اس سے نہیں ہوتا کہ جب ہم بلندی پر ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم پستی میں ہوتے ہیں...... جب ہمیں یہ کیفیت محسوس نہیں ہو رہی ہوتی تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے۔ اس راہ میں کامیابی حاصل کرنے کی کلید یہ ہے کہ ایک دفعہ جب ''پستی'' کا عالم طاری ہو جائے تو بھی سفر جاری رکھا جائے اور یاد رکھا جائے کہ ایسا ہونا نارمل ہے۔

شیطان کے ہتھکنڈے:

یاد رکھئے کہ آپ کی کیفیت کے حساب سے شیطان آپ پر حملہ آور ہونے کے لئے مختلف طریقے اپنائے گا۔

☆ سرمستی کی کیفیت میں:

جب آپ پر سرمستی کی کیفیت طاری ہو گی تو وہ آپ کو متکبر بنا کر پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ کو دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے پر آمادہ کر کے پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ کو اپنے بارے میں ایسی خوش گمانی میں مبتلا کر دے گا کہ آپ جدوجہد کرنا ہی ترک کر دیں گے کیونکہ آپ کو لگ رہا ہو گا کہ آپ پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہیں (اور دوسروں سے بہت بہتر ہیں)، اور اس طرح آپ کو پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ وہ مسلسل آپ کو ان لوگوں کی طرف دیکھنے پر مجبور کرے گا جو بظاہر آپ سے کم محنت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ آپ کو اپنی کوتاہیوں کا جواز مل سکے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ حجاب نہیں پہنتیں، تو وہ آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کرے گا: ''یہ حجاب پہننے والیاں فلاں فلاں برے کام کرتی ہیں۔ کم از کم میں ایسے کام نہیں کرتی۔ میں فلاں فلاں اچھے کام کرتی ہوں جو یہ حجاب پہننے والیاں نہیں کرتیں۔''

اور اگر آپ سے عبادت میں کوتاہی ہو جائے تو آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کرے گا۔ ''کم از کم میں فلاں فلاں کی طرح کلبوں میں گل چھرے تو نہیں اڑا رہی۔'' یاد رکھئے، اللہ کا اجر اس حساب سے تقسیم نہیں ہوتا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ روزِ محشر ہم سب تنہا ہوں گے۔ اور یہ محض شیطان کا ایک ہتھکنڈہ ہے تو آپ کو کوشش کرنے سے روک دے۔

☆ اضمحلال کی کیفیت میں:

لیکن جب آپ پر اضمحلال طاری ہوتا ہے، آپ خود کو پستی میں محسوس کرتے ہیں تو شیطان آپ پر ایک مختلف ہتھکنڈہ آزمائے گا۔ وہ آپ کو مایوسی کا شکار کر کے پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کرے گا کہ آپ بالکل بے وقعت ہیں اور کوشش کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ وہ آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کرے گا کہ آپ ایک ناکام انسان ہیں اور آپ جو کچھ بھی کر لیں، وہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے، جو کبھی آپ کو حاصل تھا۔ یا وہ آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے کہ آپ اتنے ''برے'' ہیں کہ اللہ آپ کو کبھی معاف کرے گا ہی نہیں۔ اس کے نتیجے میں، ہو سکتا ہے آپ مزید پستی میں اترنے کی طرف مائل ہو جائیں۔ ممکن ہے ایک وقت میں آپ رفعت پر تھے لیکن جب عبادت میں کوتاہی ہونے لگی تو آپ خود پر بہت شرمسار ہوئے۔ اور شاید آپ کے سابقہ زعمِ پارسائی کی وجہ سے آپ نے لوگوں کو غلطیاں کرنے یا کمزور پڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ رویہ خود شکنی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ اس کے تحت آپ خود کو بھی غلطیاں کرنے یا کمزور پڑنے کی ''اجازت'' نہیں دیتے۔

چونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو انسان بننے اور خطا کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے جب آپ سے غلطی ہو جاتی ہے تو آپ خود پر اتنے شرمسار ہوتے ہیں کہ ساری امید ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں آپ مزید گناہوں کا ارتکاب کرنے لگیں جس کی وجہ سے آپ کی مایوسی میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ اور یہ ایک خود کو دوام دینے والا ایک شیطانی چکر بن جائے گا۔ شیطان آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرے گا کہ آپ کو توبہ یا عبادت کرنے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ایسا کرنا منافقت ہو گی کیونکہ آپ تو بہت ''برے'' انسان ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اللہ

کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ یقیناً، یہ ساری باتیں جھوٹ ہیں۔ لیکن شیطان کو اپنا کام کرنا بخوبی آتا ہے۔ جب آپ سے گناہ ہو جائے، تو وہی وقت ہوتا ہے جب آپ کو پہلے سے کہیں بڑھ کر اللہ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ نہیں کہ آپ اس سے دور ہٹ جائیں۔

خود کو پستی کے اس سفر سے بچانے کے لئے، یاد رکھئے کہ نشیب اس راہ کا حصہ ہیں۔ یاد رکھئے کہ ''فتور'' یعنی ضعف بہ حیثیت انسان آپ کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جب آپ کو یہ ادراک ہو جائے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ناکام ہو گئے ہیں یا آپ منافق ہیں، تو ایسی کیفیت کا شکار ہونے کے بعد بھی آپ جدوجہد کرنا ترک نہیں کریں گے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ چند مخصوص عادات اپنا لی جائیں جن کا تعلق ''کرنے کے کم از کم کاموں'' سے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کیسا بھی محسوس کر رہے ہوں، آپ کا دل کتنا ہی بجھا ہوا کیوں نہ ہو، پھر بھی آپ کو کم از کم یہ کام تو ضرور کرنے ہیں۔ آپ کو احساس ہوگا کہ جب ایسی کیفیت طاری ہو تو آگے بڑھنا دشوار تر ہو جاتا ہے، لیکن ان کاموں کو کرتے رہنے کی کوشش جاری رکھئے۔ مثال کے طور پر، کم از کم یہ کہ روزانہ پانچ نمازیں وقت پر ادا کی جائیں۔ اس پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا جانا چاہئے، چاہے آپ پر کتنی ہی پژمردگی طاری کیوں نہ ہو۔ پنج وقتہ نماز آپ کے لئے سانس لینے کے عمل کی طرح ہونی چاہئے۔ تصور کیجئے کہ جب کبھی آپ تھکے ہوئے ہوں یا آپ کا موڈ اچھا نہ ہو تو آپ سانس نہ لینے کا فیصلہ کر لیں تو کیا ہوگا!

بہتر ہوگا کہ دیگر کاموں کو بھی اس ''کم از کم کی فہرست'' حصہ بنایا جائے۔ مثال کے طور پر، مخصوص نوافل اور اذکار یا قرآن کی تلاوت کو بھی اپنے معمول کے حصہ بنا لیجئے، خواہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ کریں۔ یاد رکھئے کہ اللہ اس چھوٹے سے کام کو بھی بہت عزیز رکھتا ہے جو پابندی سے کیا جائے، بمقابل اس کام کے جو ہو تو بہت بڑا لیکن پابندی سے نہ کیا جائے۔ اگر آپ اس پژمردگی کی کیفیت میں چند بنیادی کاموں کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو جائیں، تو ایمان کی ایک لہر آئے گی اور آپ کو پھر سے بلندی کی طرف لے جائے گی، انشاء اللہ! اور، اگر خدا نے چاہا تو جب آپ بلندی پر پہنچیں گے تو وہ آپ کی گزشتہ ''بلندی'' سے بھی زیادہ بلند ہوگی۔

یاد رکھئے کہ اللہ کی طرف جانے والی راہ ہموار نہیں ہے۔ آپ کا ایمان نشیب و فراز سے

گزرتا رہے گا۔آپ کی عبادت کرنے کی اہلیت میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔لیکن جان لیجئے کہ نشیب کے ساتھ ایک فراز بھی جڑا ہوا ہے۔بس صبر سے کام لیجئے،استقلال سے کام لیجئے،مایوسی کے شکار نہ ہوئیے اور اعانت کے لئے اللہ سے رجوع کیجئے۔راہ کٹھن ہے۔اس میں بہت سے دھکے لگیں گے اور بہت سے کھڈے آئیں گے۔لیکن زندگی کی تمام دیگر چیزوں کی طرح،اس رستے کو بھی ایک دن ختم ہونا ہے،اور اختتام پر آپ کو ساری کاوشوں کا صلہ مل جائے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے اِنسان، بے شک تجھے ہر وقت اپنے رب کی طرف کوشش کر کے بڑھتے رہنا ہے،اور پھر اس سے مل جانا ہے۔''(سورہ الانشقاق:٦)

☆☆☆

عورت کا مقام

عورتوں کو با اختیار بنانا

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی اسلام کا پیغام لے کر ایک بستی میں داخل ہوئے تو انہوں نے اسے بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا۔ انہوں نے کہا: میں تمہیں بندے کی غلامی سے نجات دلانے اور بندے کے رب کی غلامی میں دینے کے لئے آیا ہوں۔"

اس بات میں ایک زبردست خزانہ پوشیدہ ہے۔ ان الفاظ میں بااختیاری اور آزادی کی طرف جانے والے حقیقی راستے کی کلید بند ہے۔

بات یہ ہے کہ جب آپ یا میں، اپنے خالق کے علاوہ کسی بھی اور شے کو ہماری کامیابی، ہماری ناکامی، ہماری خوشی یا ہماری وقعت کا تعین کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں تو ہم غلامی کی ایک خاموش لیکن تباہ کن شکل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ شے جو میری خود توقیری، میری کامیابی اور میری ناکامی کا تعین کرتی ہے، وہی مجھے کنٹرول بھی کرتی ہے۔ اور یہ میری آقا بن جاتی ہے۔

وہ آقا جس نے ایک عورت کی وقعت کا تعین کیا ہے، وہ پوری تاریخ کے دوران کئی شکلوں میں سامنے آتا رہا ہے۔ عورت کے لئے مقرر کئے گئے غالب ترین معیارات میں سے ایک مردوں کا معیار ہے۔ لیکن جو بات ہم اکثر بھول جاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے واسطے سے عورت کو وقعت دے کر اسے اعزاز بخشا ہے...... مردوں کے واسطے سے نہیں۔ اس کے باوجود، جب مغربی "آزادیٔ نسواں" نے خدا کو منظر سے ہٹایا تو مردوں کے علاوہ کوئی اور معیار باقی نہ رہا۔ اس کے نتیجے میں مغربی آزادیٔ نسواں کی علمبردار کے پاس اپنی وقعت مردوں کے واسطے سے ڈھونڈنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا۔ اور ایسے کر کے اس نے ایک ناقص مفروضہ قبول کر لیا۔ اس نے قبول کر لیا کہ مرد ہی معیار ہے، اور لہٰذا ایک عورت جب تک مردوں جیسی نہ ہو جائے وہ ایک مکمل انسان بن ہی نہیں سکتی۔

جب کسی مرد نے اپنے بال چھوٹے کرائے تو اس نے اپنے بال چھوٹے کرانا چاہے۔

جب مرد فوج میں شامل ہوا تو وہ فوج میں شامل ہونے کی خواہشمند ہوگئی۔ اسے ان چیزوں کی طلب صرف اس وجہ سے تھی کیونکہ اس کے "معیار" کے پاس یہ چیزیں موجود تھیں۔

جو بات وہ سمجھ نہ پائی وہ یہ تھی کہ عورت اور مرد دونوں کو اللہ نے ان کی انفرادیت میں عزت بخشی ہے..... یکسانیت میں نہیں۔ جب ہم مردوں کو معیار کے طور پر قبول کر لیتی ہیں، تو اچانک ہر چیز جو خاص نسوانی ہے، اس تعریف کے تحت کمتر ہو جاتی ہے۔ حساس ہونا ایک گالی ہے، کل وقتی ماں بننا توہین ہے۔ عاقلانہ غیر جذباتیت (جسے مردوں سے منسوب کیا جاتا ہے) اور بے غرض دردمندی (جسے عورتوں سے منسوب کیا جاتا ہے) کے درمیان ہونے والی جنگ میں عقل و منطق کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

جیسے ہی ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ جو چیز بھی مرد کے پاس ہے، جو کام بھی وہ کرتا ہے، وہ بہتر ہے، اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ محض ایک اضطراری ردِعمل تھا: اگر مردوں کے پاس یہ چیز ہے تو ہمیں بھی چاہئے۔ اگر مرد اگلی صفوں میں نماز ادا کرتے ہیں، تو ہم فرض کر لیتی ہیں کہ یہی بہتر ہے، لہٰذا ہم بھی اگلی صفوں میں نماز ادا کرنا چاہتی ہیں۔ اگر مرد امامت کراتا ہے تو ہم فرض کر لیتی ہیں کہ امام خدا کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، اس لئے ہم بھی امامت کرانا چاہتی ہیں۔ اس کشاکش میں کہیں ہم نے یہ تصور قبول کر لیا ہے کہ دنیاوی قیادت کا مرتبہ حاصل کرنا خدا کے سامنے انسان کے مرتبے کی کوئی علامت ہے۔

لیکن ایک مسلمان خاتون کو اپنے آپ کو اس انداز میں ذلیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا معیار اللہ کی ذات ہے۔ اس کی قدر و وقعت اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اس کے لئے اسے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔

ایک عورت کی حیثیت سے ہمیں ملنے والی فضیلت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اگر ہم کوئی ایسی شخصیت یعنی مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں جو کہ ہم نہیں ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ ہم بننا بھی نہیں چاہتیں، تو ہم خود کو ذلیل کرتی ہیں۔ بطور خواتین، ہمیں تب تک حقیقی آزادی حاصل نہیں ہوگی جب تک کہ ہم مردوں کی نقالی کرنا چھوڑ نہ دیں، اور اس انفرادیت کی خوبصورتی کی قدر کرنا سیکھ لیں جو کہ خدا نے ہمیں عطا کی ہے۔

اور اس کے باوجود، معاشرے میں، ایک اور ''آقا'' جابجا نظر آتا ہے جس نے عورتوں کے لئے ان کی وقعت کا تعین کیا ہے۔ اور یہ نام نہاد معیار، حسن وخوبصورتی کا ہے۔ بچپن سے ہی، بطور عورت ہمیں معاشرے کی جانب سے ایک بڑا واضح پیغام دیا جاتا ہے۔ اور وہ پیغام یہ ہے: ''دبلی ہو جاؤ۔ پُرکشش ہو جاؤ۔ خوبصورت ہو جاؤ۔ یا پھر...... بے وقعت ہو جاؤ۔''

لہٰذا ہمیں کہا گیا کہ ان کا میک اپ کریں اور ان کے دیئے ہوئے شارٹ سکرٹ پہنیں۔ ہمیں ہدایت کی گئی اپنی زندگیاں، اپنے جسم اور اپنا وقار خوبصورت بننے کے نصب العین پر قربان کر دیں۔ ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جو کچھ بھی کریں، ہماری قدر اسی حد تک ہوگی جس حد تک ہم مردوں کو خوش کر سکیں اور ان کے سامنے خوبصورت بن کر آ سکیں۔ لہٰذا ہم نے اپنی زندگیاں فیشن میگزینوں کے سرورق پر گزاریں اور ہم نے اپنا جسم اشتہار بازوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے فروخت کریں۔

ہم غلام تھیں، لیکن انہوں نے ہمیں سکھایا کہ ہم آزاد ہیں۔ ہم ان کا کھلونا تھیں، مگر انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ یہ کامیابی ہے۔ کیونکہ انہوں نے آپ کو سکھایا کہ آپ کی زندگی کا مقصد ہی یہی ہے کہ آپ نمائش کی چیز بنی رہیں، مردوں کو کشش کریں اور ان کے لئے خوبصورت بن کر سامنے آئیں۔ انہوں نے آپ کو یقین دلا دیا کہ آپ کا جسم ان کی کاروں کی مارکیٹنگ کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

لیکن انہوں نے جھوٹ بولا۔

آپ کا جسم، آپ کی روح کسی ارفع تر مقصد کے لئے تخلیق کئے گئے تھے۔ کسی نہایت ارفع تر مقصد کے لئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔'' (سورہ الحجرات: ۱۳)

یوں آپ کو عزت بخشی گئی۔ مگر آپ کو یہ عزت مردوں کے واسطے، ان کی نقالی کرنے سے یا انہیں خوش کرنے سے نہیں ملی۔ بہ حیثیت عورت آپ کی قدر کا تعین آپ کی کمر کے سائز یا

آپ کے عاشقوں کی تعداد سے نہیں ہوتا۔ بطور انسان آپ کی قدر کا تعین ایک اعلیٰ تر پیمانے پر کیا جاتا ہے یعنی راست بازی اور تقویٰ کا پیمانہ۔ اور فیشن میگزین جو کچھ بھی کہتے رہیں، آپ کی زندگی کی مقصد محض مردوں کے لئے خوبصورت نظر آنے سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔

ہماری تکمیل خدا کی اور اس کے ساتھ ہمارے رشتے کی بدولت ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود، بچپن سے، ہمیں، بطور عورت، یہ سکھایا گیا ہے کہ جب تک کوئی مرد ہمیں آ کر مکمل نہ کرے۔ ہماری ذات ادھوری رہے گی۔ سنڈریلا کی طرح ہمیں سکھایا گیا کہ جب تک کوئی شہزادہ ہمیں بچانے کے لئے نہیں آئے گا، ہم بے یار و مددگار رہیں گی۔ ''خوابیدہ حسینہ'' (Sleeping Beauty) کی طرح ہمیں بتایا گیا کہ ہماری زندگی اس وقت تک پوری طرح سے شروع نہیں ہوگی جب تک کہ ''پرنس چارمنگ'' ہمارا بوسہ نہ لے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کوئی شہزادہ آپ کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اور کوئی شہسوار آپ کو بچا نہیں سکتا۔ یہ کام صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔

آپ کا شہزادہ محض ایک انسان ہے۔ خدا اسے آپ کا رفیق بننے کے لئے بھیج سکتا ہے لیکن آپ کا نجات دہندہ بننے کے لئے نہیں۔ وہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتا ہے لیکن آپ کے پھیپھڑوں میں داخل ہونے والی ہوا نہیں۔ آپ کو ہوا خدا کی ذات سے حاصل ہوگی۔ آپ کی نجات اور آپ کی تکمیل اس کی قربت میں پوشیدہ ہے...... کسی مخلوق کی قربت میں نہیں۔ کسی شہزادے کی قربت میں نہیں، کسی فیشن، حسن یا سٹائل کی قربت میں نہیں۔

اور اس لئے میں آپ سے کہتی ہوں کہ یہ سب باتیں ذہن سے اتار پھینکئے۔ میں آپ سے کہتی ہوں کہ دنیا کو بتا دیجئے کہ آپ کسی کی غلام نہیں ہیں...... نہ فیشن کی، نہ حسن، اور نہ مردوں کی۔ آپ صرف اور صرف اللہ کی غلام، اللہ کی بندی ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں کہ دنیا کو بتا دیجئے کہ آپ یہاں مردوں کو اپنے جسم سے خوش کرنے کے لئے نہیں آئیں۔ آپ یہاں اللہ کو خوش کرنے کیلئے آئی ہیں۔ لہٰذا وہ جو آپ کے خیر خواہ ہیں اور آپ کو ''آزاد'' کرانا چاہتے ہیں، ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان سے کہہ دیجئے۔ ''شکریہ، مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

انہیں بتا دیجئے کہ آپ یہاں کوئی نمائش کی چیز بن کر نہیں آئیں۔ اور آپ کا جسم لوگو

کے لئے آنکھیں سینکنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس بات کو یقینی بنائیے کہ دنیا کو پتہ چل جائے کہ آپ
کبھی خود کو ایک کھلونا نہیں بننے دیں گی، جوتے بیچنے کے لئے ٹانگوں کا ایک جوڑا نہیں بننے دیں
گی۔ آپ ایک روح، ایک ذہن، اللہ کی ایک بندی ہیں۔ اور آپ کی وقعت کا تعین اس روح،
اس دل، اس اخلاقی کردار کے حسن سے ہوتا ہے۔ اس لئے آپ خوبصورتی کے معیارات کی
پرستش نہیں کرتیں، آپ ان کی ''فیشن سنس'' پر یقین نہیں رکھتیں۔ آپ کا یقین، آپ کا ایمان
کسی اعلیٰ تر ہستی پر ہے۔

لہٰذا اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ایک عورت کہاں اور کیسے بااختیاری پا سکتی ہے،
مجھے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیؓ کا قول یاد آتا ہے۔ وہی احساس ایک بار پھر
جاگ اٹھتا ہے کہ حقیقی آزادی اور بااختیاری صرف اس میں ہے کہ خود کو باقی سب آقاؤں،
سب تعاریف و معیارات کی غلامی سے چھڑا لیا جائے۔

بطور مسلمان خواتین، ہمیں اس خاموش غلامی سے آزاد کرا دیا گیا ہے۔ مردوں جیسی
عزت پانے کے لئے ہمیں معاشرے کے خوبصورتی یا فیشن کے معیار کی ضرورت نہیں۔ عزت
پانے کے لئے ہمیں مردوں جیسا بننے کی ضرورت نہیں، اور ہمیں کسی شہزادے کی منتظر رہنے کی
ضرورت نہیں کہ وہ آ کر ہمیں بچائے یا ہماری تکمیل کرے۔ ہماری وقعت، ہماری عزت، ہماری
نجات اور ہماری تکمیل بندوں میں پوشیدہ نہیں۔

بلکہ بندوں کے آقا میں پوشیدہ ہے۔

اس تہذیب کے نام ایک خط جس نے مجھے پروان چڑھایا

بچپن میں تم نے مجھے بطخ کے بدصورت بچے کی کہانی سنائی، اور سالوں میں یہی سمجھتی رہی
کہ وہ بچہ میں تھی۔ ایک طویل عرصے تک تم مجھے یہ پڑھاتے رہے کہ میں معیار (یعنی مردوں)
کی ایک بھونڈی نقل کے سوا کچھ نہیں۔

میں ان کے جتنا تیز نہیں بھاگ سکتی تھی یا ان کے جتنا وزن نہیں اٹھا سکتی تھی۔ میں اتنا
پیسہ نہیں کماتی تھی اور میں اکثر رو دیتی تھی۔ میں مردوں کی ایک دنیا میں بڑی ہوئی جہاں میرا
کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اور جب میں مرد نہ بن سکی تو میں اسے خوش کرنے میں جٹ گئی۔ میں تمہارا میک اپ لگایا اور تمہارے شارٹ سکرٹ پہنے۔ میں اپنی زندگی، اپنا جسم، اپنا وقار، خوبصورت بننے کے مقصد کے لئے قربان کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ میں خواہ کچھ بھی کرلوں، میری توقیر بس اس حد تک ہے جس حد تک اپنے مالک کو خوش کرسکتی ہوں اور اس کے لئے خوبصورت بن سکتی ہوں۔ اور اس لئے میں نے اپنی زندگی فیشن میگزین کے سرورق پر گزاری اور اپنا جسم تمہیں فروخت کرنے کو دے دیا۔

میں ایک غلام تھی مگر تم نے مجھے پڑھایا کہ میں آزاد ہوں۔ میں تمہارا کھلونا تھی، مگر تم نے قسم کھا کر کہا کہ یہی کامیابی ہے۔ تم نے مجھے سکھایا کہ میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ نمائش کی چیز بن کر رہوں، مردوں کو رجھاؤں اور ان کے لئے خوبصورت نظر آؤں۔ تم نے مجھے یہ یقین دلا دیا کہ میرا جسم تمہاری کاروں کی مارکیٹنگ کے لئے بنا ہے۔ اور تم نے مجھے اس سبق کے ساتھ پروان چڑھایا کہ میں بطخ کا بدصورت بچہ ہوں۔ لیکن تم نے جھوٹ بولا۔

اسلام مجھے بتاتا ہے کہ میں ایک راج ہنس ہوں۔ میں مختلف ہوں...... اور میرا مختلف ہونا ہی درست ہے۔ اور میرا جسم، میری روح کسی ارفع تر مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اللہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

> ''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک (ہی) مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور کنبے قبیلے بنا دیئے ہیں تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، اللہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، یقین مانو کہ اللہ دانا اور باخبر ہے۔'' (سورہ الحجرات: ۱۳)

اس لئے مجھے عزت بخشی گئی لیکن یہ عزت مردوں کے ساتھ میرے تعلق کی بدولت نہیں تھی۔ ایک عورت کے طور پر میری قدر و وقعت کا پیمانہ میری کمر کا سائز یا میرے عاشقوں کی تعداد نہیں۔ ایک انسان کے طور پر میری قدر و قیمت ایک اعلیٰ تر پیمانے پر متعین کی جاتی ہے یعنی راست بازی اور تقویٰ کے پیمانے پر۔ اور فیشن میگزین جو بھی کہتے رہیں، میرا مقصد حیات محض مردوں کے لئے خوبصورت نظر آنے سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔

اور اس لئے، خدا مجھ سے کہتا ہے کہ خود کو ڈھانپ کر رکھوں، اپنی خوبصورتی چھپاؤں اور دنیا سے کہہ دوں کہ میں یہاں اپنے جسم سے مردوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں آئی، میں یہاں اپنے رب کو خوش کرنے کے لئے آئی ہوں۔ اللہ یہ حکم دے کر عورت کے جسم کا وقار بڑھا دیتا ہے کہ اس کی عزت کی جائے اور اسے ڈھانپ کر رکھا جائے، صرف اسی کے سامنے عیاں کیا جائے جو اس کا مستحق ہے یعنی وہ شخص جس سے میری شادی ہوگی۔

اس لئے جو مجھے ''آزاد'' کرانا چاہتے ہیں، ان سے میں ایک ہی بات کہنا چاہتی ہوں۔ ''شکریہ، مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

میں یہاں نمائش کی چیز بننے کے لئے نہیں آئی۔ میرا جسم لوگوں کو دعوتِ نظارہ دینے کے لئے نہیں ہے۔ میں اپنے مقام سے گر کر ایک کھلونا یا جوتے بیچنے کے لئے ٹانگوں کی ایک جوڑی نہیں بنوں گی۔ میں ایک روح، ایک ذہن، اللہ کی ایک بندی ہوں۔ میری قدر و وقعت کا تعین میری روح، میرے دل، اور میرے اخلاقی کردار کی خوبصورتی سے ہوتا ہے۔ اس لئے میں تمہارے معیاراتِ حسن کی پرستش نہیں کروں گی، اور میں تمہارے فیشن کے شعور کو تسلیم نہیں کرتی۔ میری تسلیم و رضا کسی اعلیٰ تر ہستی کے لئے ہے۔

اپنے حجاب کے ذریعے میں اپنی خوبصورتی کے بجائے، اپنے عقیدے کی نمائش کرتی ہوں۔ ایک انسان کے طور پر میری قدر و قیمت کا تعین میرے حسن سے نہیں، اللہ کے ساتھ میرے رشتے سے ہوتا ہے۔ میں غیر متعلقہ چیزوں کو ڈھانپ کر رکھتی ہوں۔ اور جب تم مجھے دیکھتے ہو تو تمہیں ایک جسم نظر نہیں آتا۔ تم مجھے اسی حیثیت مین دیکھتے ہو جو کہ میں ہوں یعنی اپنے خالق کی ایک بندی۔

حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان عورت، مجھے ایک خاموش قسم کی غلامی سے چھڑا لیا گیا ہے۔ میں اس زمین پر اللہ کے غلاموں کو جواب دہ نہیں ہوں۔ میں ان کے بادشاہ کو جواب دہ ہوں۔

نماز کی امامت پر ایک عورت کے خیالات

18 مارچ 2005ء کے روز آمنہ ودود جمعے کی نماز کی امامت کرنے والی پہلی خاتون

ہیں۔ اس روز عورتوں نے مردوں سے مزید مشابہت اختیار کرنے کی طرف ایک بڑا قدم اٹھایا۔
لیکن کیا ہم خدا کی عطا کردہ آزادی کو حقیقی شکل دینے کے قریب آسکیں؟
میں ایسا نہیں سمجھتی۔

جو بات ہم اکثر بھول جاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ نے عورت کو مردوں کے ساتھ تعلق کے واسطے سے نہیں بلکہ اپنے ساتھ تعلق کے واسطے سے وقعت دے کر اسے عزت بخشی ہے۔
لیکن جب مغربی حقوقِ نسواں کی علمبرداروں نے خدا کو منظر سے ہٹا دیا تو مردوں کے علاوہ اور کوئی معیار ہی باقی نہ بچا۔ اس کے نتیجے میں، مغربی حقوقِ نسواں کی علمبردار اس بات پر مجبور ہوگئی اپنی قدر و وقعت مردوں کی نسبت سے تلاش کرے۔ اور ایسا کرنے میں اس نے ایک ناقص مفروضہ اپنا لیا۔ اس نے یہ مان لیا ہے کہ مرد معیار ہے، اور لہٰذا کوئی عورت تب تک ایک کامل انسان نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ بالکل مردوں جیسی نہ بن جائے۔

جب کسی مرد نے اپنے بال چھوٹے کرائے تو اس نے اپنے بال چھوٹے کرانا چاہے۔
جب مرد فوج میں شامل ہوا تو وہ فوج میں شامل ہونے کی متمنی ہوگئی۔ ان چیزوں کی خواہش کی واحد وجہ یہ کہ اس کے ''معیار'' کے پاس یہ چیزیں موجود تھیں۔

جو بات وہ سمجھ نہ پائی وہ یہ تھی کہ عورت اور مرد دونوں کو اللہ نے ان کی انفرادیت میں عزت بخشی ہے...... یکسانیت میں نہیں۔ اور 18 مارچ کے روز، مسلم خواتین ٹھیک اسی غلطی کی مرتکب ہوئیں۔

چودہ سو سالوں سے علما کا اجماع چلا آرہا ہے کہ امامت مرد کرائیں گے۔ بہ حیثیت ایک مسلمان خاتون، اس بات کی کیا اہمیت ہے؟ جو نماز کی امامت کراتا ہے تو روحانی اعتبار سے کسی بھی طرح سے برتر نہیں ہوتا۔ کوئی کام صرف اس لئے اچھا نہیں ہو جاتا کہ کوئی مرد اسے کرتا ہے۔ اور نماز کی امامت کرنے محض اس لئے اچھا نہیں کہ یہ امامت ہے۔ اگر یہ عورتوں کا کام ہوتا یا زیادہ بافضیلت کام ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاریخ کی عظیم ترین خواتین یعنی حضرت عائشہؓ، یا حضرت خدیجہؓ یا حضرت فاطمہؓ سے امامت کرانے کو کیوں نہ کہتے؟ ان خواتین سے جنت کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی امامت نہیں کرائی۔

لیکن اب چودہ سو سال میں پہلی مرتبہ، ہم ایک مرد کو امامت کراتے دیکھتی ہیں اور سوچتی ہیں: ''یہ منصفانہ بات نہیں۔'' ہم اس کے باوجود ایسا سوچتی ہیں کہ خدا نے امامت کرانے والے کو کوئی خصوصی فضیلت عطا نہیں کی۔ امام کا رتبہ اللہ کی نگاہوں میں ان سے زیادہ نہیں ہوتا جو اس کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف، صرف ایک عورت ہی ماں بن سکتی ہے۔ اور اللہ نے ماں کو خصوصی فضیلت عطا کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھایا کہ جنت ماؤں کے قدموں میں ہے۔ لیکن کوئی مرد خواہ کچھ بھی کر لے، وہ کبھی ماں نہیں بن سکتا۔ تو پھر یہ چیز غیر منصفانہ کیوں نہیں ہے؟

جب سوال کیا گیا کہ ہماری خدمت واپنائیت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ اس کے جواب میں کہا: ''ماں۔'' اور چوتھی مرتبہ، صرف ایک بار کے لئے، باپ کا نام لیا۔ کیا یہ صنفی امتیاز ہے؟ کوئی مرد خواہ کچھ بھی کر لے، وہ کبھی ماں کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

اور اس کے باوجود، جب خدا ہمیں کسی منفرد نسوانی خصوصیت سے عزت بخش بھی دیتا ہے، ہم اس کی قدر و قیمت بھی مردوں کے حوالے سے تلاش کرنے میں مصروف رہتی ہیں یا کبھی کبھی ہمارا اس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ ہم نے بھی مردوں کو معیار کے طور پر قبول کر لیا ہے، اس لئے جو چیز منفرد طور پر نسوانی ہوگی، وہ اپنی اصل میں ہی کمتر سمجھی جائے گی۔ حساس ہونا ایک گالی ہے، ماں بننا ایک ذلت۔ عاقلانہ غیر جذباتیت (جسے مردانہ سمجھا جاتا ہے) اور بے لوث دردمندی (جسے نسوانی سمجھا جاتا ہے) کے درمیان ہونے والی جنگ میں، عقل و منطق کو غلبہ حاصل ہے۔

جیسے ہی ہم یہ قبول کر لیتی ہیں کہ جو چیز بھی مرد کے پاس ہے اور جو کام بھی وہ کرتا ہے، وہ بہتر ہے، اس کے بعد جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اضطراری ردِعمل سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا: اگر مردوں کے پاس یہ چیز ہے تو مجھے بھی چاہئے۔ اگر مرد اگلی صفوں میں نماز ادا کرتے ہیں تو ہم فرض کر لیتی ہیں کہ ایسا کرنا ہی بہتر ہے، اس لئے ہم بھی اگلی صفوں میں نماز ادا کرنا چاہتی ہیں۔

اگر مرد نماز کی امامت کراتے ہیں، ہم فرض کر لیتی ہیں کہ امام اللہ کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، اس لئے ہم بھی امامت کرانا چاہتی ہیں۔ راستے میں کہیں ہم نے یہ تصور قبول کر لیا ہے کہ دنیاوی قیادت کے مرتبے پر فائز ہونا کسی طرح سے اللہ کی نگاہ میں ہمارے رتبے کی نشاندہی کرتا ہے۔

ایک مسلمان عورت کو خود کو اس طرح ذلیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا معیار اللہ کی ذات ہے۔ اس کی قدر و وقعت اللہ کی عطا کی ہوئی ہے۔ اسے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مردوں کی پیروی کرنے کی جدوجہد میں، ہم عورتوں نے کبھی رک کر اس امکان کا جائزہ ہی نہیں لیا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہ ہمارے لئے بہتر ہے۔ بعض معاملات میں ہم محض مردوں جیسی بننے کے لئے ارفع تر چیز کو بھی چھوڑ دیتی ہیں۔

پچاس سال پہلے، معاشرے نے ہمیں بتایا کہ مرد اس لئے برتر ہیں کیونکہ وہ گھروں کو چھوڑ کر کارخانوں میں جا کے کام کرتے ہیں۔ ہم مائیں تھیں۔ اور اس کے باوجود، ہمیں بتایا گیا کہ ایک اور انسان کی پرورش کرنے کے بجائے عورت کی آزادی اس میں ہے کہ وہ جا کر مشین چلائے۔ ہم نے یہ قبول کر لیا کہ کارخانے میں کام کرنا معاشرے کی بنیاد ڈالنے سے زیادہ بہتر کام ہے، صرف اس لئے کہ مرد یہ کام کرتے تھے۔

پھر، کام کرنے کے بعد، ہم سے توقع کی جانے لگی کہ ہم مافوق الفطرت قوت کا مظاہرہ کریں گی...... بہترین ماں، بہترین بیوی، بہترین خاتونِ خانہ بننے کے ساتھ ساتھ بہترین کریئر بھی تعمیر کریں گی۔ اور اگرچہ اصلاً ایک عورت کے کریئر بنانے میں کچھ غلط نہیں ہے، ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ مردوں کی اندھا دھند نقالی کرنے کے چکر میں ہم کیا قربان کر بیٹھی ہیں۔ ہمارے بچے ہماری نگاہوں کے سامنے اجنبی بن گئے اور جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ہم نے کس فضیلت کو ترک کر دیا ہے۔

اور لہٰذا اب آ کر، اگر فیصلے کا اختیار دیا جائے، تو مغرب کی عورتیں بچوں کی پرورش کے لئے گھر پر رہنے کا انتخاب کر رہی ہیں۔ امریکہ کے محکمہ زراعت کے مطابق، چھوٹے بچوں والی صرف 31 فیصد مائیں، اور دو یا دو سے زیادہ بچوں والی 18 فیصد مائیں ہی کل وقتی پیشہ ورانہ کام کر رہی ہیں۔ اور 2000ء میں ''پیرنٹنگ'' (Parenting) نامی میگزین کی طرف سے

کرائے گئے ایک سروے میں معلوم ہوا کہ ان کام کرنے والی ماؤں میں سے 93 فیصد کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ گھر پر رہنے کو ترجیح دیں گی لیکن "مالی ذمہ داریوں" کی وجہ سے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ "ذمہ داریاں" جدید مغرب میں اصناف کی یکسانی کی بدولت عورتوں پر تھوپ دی گئی ہیں، اور اسلام نے عورت کی صنف کو انفرادی حیثیت دے کر اسے ان ذمہ داریوں سے مبرا کر دیا ہے۔

مغرب میں تقریباً ایک صدی کے تجربات کے بعد عورتوں کو اس فضیلت کا ادراک ہوا جو مسلمان عورتوں کو چودہ سو سال پہلے دے دی گئی تھی۔

ایک عورت کی حیثیت سے اپنی فضیلت کے مدنظر، اگر میں کوئی ایسی ہستی بننے کی کوشش کرتی ہوں...... اور سچی بات یہ ہے کہ بننا بھی نہیں چاہتی...... یعنی مرد تو میں محض اپنا مقام گھٹا رہی ہوں۔ بطور عورت، ہمیں تب تک حقیقی آزادی حاصل نہ ہوگی جب تک کہ ہم مردوں کی نقالی کرنا چھوڑ نہ دیں، اور خدا کی طرف سے عطا کردہ انفرادیت کے حسن کو قدر و قیمت دینا نہ سیکھ لیں۔

اگر غیر جذباتی انصاف اور دردمندی میں سے کسی ایک کو چننے کا اختیار دیا جائے تو میں دردمندی کو چنتی ہوں۔ اور اگر دنیاوی قیادت اور اپنے قدموں میں جنت میں سے کسی ایک کو چننے کا اختیار دیا جائے تو میں جنت کو چنتی ہوں۔

مردانگی اور سخت ہونے کا ڈھونگ

گزشتہ ہفتے میری بہن کا فون آیا۔ وہ موسم گرما کے آغاز سے تعلیم کے سلسلے میں بیرونِ ملک تھی، اس لئے قدرتی بات تھی کہ اس کی آواز سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس کا حال احوال سننے کے بعد، میں نے اس کے نئے گھر کے بارے میں دریافت کیا۔ چونکہ وہ ایک مسلم ملک میں رہ رہی تھی، اس لئے مجھے یقین تھا کہ ہر چیز ٹھیک ہوگی۔ اسی لئے جب اس نے میری بات کا جواب دیا تو مجھے شدید جھٹکا لگا۔ اس نے ایک ایسی جگہ کا احوال بیان کر شروع کر دیا جہاں ایک لڑکی کو گھر سے باہر نکلتے ہی کسی نہ کسی راہگیر مرد کی لفظی ہراسگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے کہا کہ آوازے کسنے کا کام کوئی کوئی نہیں، بلکہ خیر سے سب ہی کرتے ہیں۔ پھر اس نے مجھے

اپنی جاننے والی ایک مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا۔ لڑکی ٹیکسی میں جا رہی تھی اور جب وہ اپنی منزل پر پہنچی تو اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس کا کرایہ دیا۔ ایسے ممالک میں سے کئی ایک میں میٹرز کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی، اس لئے چونکہ کرائے کا معاملہ کسی حد تک من مانا تھا، اس لئے ڈرائیور غصے میں آ گیا۔ ہوتے ہوتے جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ ڈرائیور نے لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ اس پر لڑکی بھی غصے میں آ گئی اور ڈرائیور کو سخت سست سنا ڈالیں۔ تب اس ڈرائیور نے اس لڑکی کے منہ پر گھونسہ دے مارا۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے میں بری طرح سے مضطرب ہو چکی تھی۔ لیکن میری بہن کی بتائی ہوئی اگلی بات سب سے زیادہ تباہ کن تھی۔ پاس ہی مردوں کی ایک ٹولی بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے، وہ بھاگتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ قدرتی بات تھی کہ وہ لڑکی کی مدد کرنے کے لئے آئے ہوں گے۔

نہیں۔ وہ کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔

کہانی کے اس موڑ پر پہنچ کر میرے ذہن میں کچھ خیالات ابھرنے لگے۔ اچانک میں نے خود کو مردانگی کی ہر اس تعریف پر سوال اٹھاتے ہوئے پایا جس پر آج تک یقین رکھتی آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیسے ایک مرد...... بلکہ ایک نہیں، کئی...... کھڑے ہو کر ایک عورت کے ساتھ بدسلوکی ہوتی دیکھ سکتے ہیں، ایک انگلی ہلائے بغیر۔ اس نے مجھے یہ سوال اٹھانے پر مجبور کیا کہ کون سے آدرش یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آج کے معاشرے میں ایک مرد ہونے کا مطلب کیا ہو گا۔ کیا مردانگی کی تعریف اتنی مسخ ہو گئی ہے کہ بعض بے قابو جنسی خواہش کے علاوہ اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا؟ کیا ''گھوڑے پر سوار شہزادے'' کی تصویر کی جگہ واقعی لفنگوں جیسا حلیہ بنائے، گلی میں لڑکیوں پر آوازے کستے لڑکوں نے لے لی ہے؟

سب سے بڑھ کر اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آج ایک مسلمان مرد ہونے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیا بہ حیثیت مسلمانوں ہماری غلبے کی تعاریف وہی ہیں جو ہونی چاہئیں؟ آج، مرد سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ بے حس ہو، غیر جذباتی ہو، جذبات کا اظہار نہ کرتا ہو، سخت جان، اور نہ جھکنے والا ہو۔ جسمانی جارحیت کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے اور جذبات

کے اظہار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ تب میں نے ایک مرد ہونے کے مفہوم کے مثالی نمونے کا تجزیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

آج مردانگی کی سب سے عام تعاریف میں سے ایک جذبات کا اظہار نہ کرنا ہے۔ تقریباً سبھی مانتے ہیں کہ رونا ''مردوں والی بات'' نہیں اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اور اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نہایت مختلف انداز میں بیان کیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں ان کا نواسہ دیا گیا جو دم توڑ رہا تھا، تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آپ کے صحابی حضرت سعدؓ نے سوال کیا: ''رسول اللہ ﷺ، یہ کیا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ رحم ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کیا ہے۔ اور یقیناً اللہ اپنے بندوں میں سے اس پر رحم کرتا ہے جو خود رحم کرنے والا ہوتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

لیکن آج ایک مرد سے نہ صرف یہ توقع رکھی جاتی ہے وہ اپنے غم اور ملال چھپائے، بلکہ شروع سے ہی اسے یہ سبق بھی پڑھا دیا جاتا ہے کہ دوسرے جذبات کا اظہار بھی نہیں کرنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی کچھ مرد ایسے تھے جو ایسا ہی سمجھتے تھے۔ ایک روز ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ آپ نے اپنے نواسوں کے ماتھوں پر بوسہ دیا۔ اس پر دیہاتی نے حیران ہو کر کہا۔ ''میرے دس بچے ہیں۔ میں نے تو کبھی ان میں سے کسی کو نہیں چوما!''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف نگاہ ڈالی اور فرمایا: ''جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔'' (صحیح بخاری) درحقیقت، شفقت ومحبت کا اظہار کرنے کے معاملے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ بڑا واضح تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی شخص اپنے دینی بھائی سے محبت کرتا ہے تو اس کو اسے بتا دینا چاہئے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔'' (ابوداؤد)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج مطہراتؓ کے لئے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا اسی وقت

کھاتے تھے جب میں ان کے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ دونوں ایک ہی پیالے سے پانی پیتے تھے، اور آپ ﷺ دیکھتے تھے کہ حضرت عائشہؓ نے کہاں لب رکھ کر پانی پیا ہے، پھر خود اسی جگہ لب رکھ کر پانی پیتے تھے۔ جس ہڈی سے آپ کھاتیں، نبی اکرم ﷺ بعد میں اسی ہڈی سے کھاتے، اور اپنا دہن مبارک وہیں رکھتے ہیں، جہاں حضرت عائشہؓ نے رکھا تھا۔ (صحیح مسلم)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے، جو کہ مردانگی کے وسیع پیمانے پر پائے جانے والے تصور کے یکسر برعکس ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کپڑوں کو پیوند لگاتے تھے، بکریوں کا دودھ دوہتے تھے اور گھر کے کاموں میں مدد کرتے تھے۔'' (بخاری ومسلم)

لیکن غالباً مردانگی کے حوالے سے ایک سب سے عام پایا جانے والا تصور یہ ہے کہ ایک مرد کو ''سخت'' ہونا چاہئے۔ نرمی کو زیادہ تر لوگ محض ایک نسوانی خصوصیت سمجھتے ہیں، اور اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نرم مزاج ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی پر وہ اجر عطا کرتا ہے جو کہ وہ سختی پر عطا نہیں کرتا، اور نہ ہی کسی اور چیز کے لئے۔'' (مسلم) ایک اور حدیث میں آپ ﷺ ارشاد کرتے ہیں: ''جس سے نرمی چھین لی گئی، اس سے خیر چھین لیا گیا۔'' (مسلم)

اور اس کے باوجود مردانگی کی ہماری جدید تعریف سے نرمی کو بہت حد تک خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ سوچ کر خوف آتا ہے کہ ایک لڑکا یہ سوچتا ہے کہ راہ چلتے کسی عورت کو جنسی طور پر ہراساں کرنا مردانگی ہے، لیکن ایک لڑکی کو مار کھاتے چپ چاپ کھڑے دیکھنے سے اس کی مردانگی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ چیز آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ شاید ہمارے ہاں ''مردانگی'' کا تصور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت رکھنے کے بجائے بالی ووڈ کی کسی گینگسٹر فلم سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

☆☆☆

امت

سابقہ ہٹا دیجیے

آپ کس قسم کے مسلمان ہیں؟ سوال عجیب سا لگتا ہے لیکن جو اسلام میں پھوٹ ڈال کر اسے فتح کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب نہایت اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن وہ لیبل ہیں جو ہم خود پر چپکاتے ہیں۔

اپنے خاندانوں میں، ہم میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو کہیں گے کہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کبھی ان کا اختلاف نہیں ہوا۔ لیکن جب خاندان کا کوئی رکن کوئی غلطی کرتا ہے، خواہ بڑی غلطی ہی کیوں نہ کرے، یا آپ اس کے نقطہ نظر سے متفق نہیں ہوتے، اور بھی کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس خاندان سے جان چھڑا کر اپنا نام تبدیل کر لیں گے۔ آج، یہ بات ہمارے مسلم خاندان کے لئے نہیں کہی جا سکتی۔

آج ہم محض ''مسلم'' نہیں ہیں۔ ہم ''ترقی پسند'' ہیں، ''اسلام پسند'' ہیں، ''روایت پسند'' ہیں، ''سلفی'' ہیں، ''مقامی'' ہیں، اور ''مہاجر'' ہیں۔ اور ہر گروہ دوسروں سے اتنا بیگانہ ہو گیا ہے کہ ہم تقریباً بھول ہی گئے ہیں کہ ہم سب ایک ہی دین کے ماننے والے ہیں۔

اگرچہ امت میں حقیقی اختلافات پائے جاتے ہیں، لیکن کہیں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اسلام کے اندر اختلافات کو نہ صرف برداشت کیا جاتا ہے، بلکہ انہیں اللہ کی رحمت قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم خود پر ایک لیبل چپکاتے ہیں اور خود سے اختلاف رکھنے والوں کو حاشیئے پر دھکیل دیتے ہیں، ہمارے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ جب ہم ان لیبلز کو قبول کر کے اپنے دل میں اتار لیتے ہیں اور اپنی پہچان کا مرکزی وسیلہ بنا لیتے ہیں، تو تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، ہم اپنے کیمپ بنا لیتے ہیں، صرف اپنے اجتماعات اور کانفرنسز میں جاتے ہیں، جلد ہی ہماری بات چیت صرف ان سے رہ جاتی ہے جو ہم سے متفق ہوتے ہیں۔ امت کے اندر مکالمہ ختم ہو جاتا ہے، ہمارے اختلافات میں مزید شدت آتی ہے اور ہمارے نقطہ ہائے نظر اور بھی انتہا پسندانہ ہو جاتے ہیں۔ زیادہ عرصہ

نہیں گزرتا، کہ ہم اس بات کی پروا کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کے ''دوسرے'' گروہ والوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہے، ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا تھا کہ مسلمان ایک جسد واحد کی طرح ہیں لیکن ہم اس جسد واحد کے اعضاء کی قطع وبرید کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ''دوسرے'' (جو بہر صورت ہمارے بھائی ہی ہوتے ہیں) ہمارے لئے اتنے اجنبی بلکہ قابل نفرت ہوتے ہیں کہ ہم چاہنے لگتے ہیں کہ ہمارے خاندان کا نام ان کے نام کے ساتھ لگایا ہی نہ جایا، اور یہاں تک کہ ان کے خلاف اپنے دشمنوں سے بھی اتحاد کر لیتے ہیں۔

اچانک، وہ اختلافات جو ایک وقت میں رحمت ہوا کرتے تھے، ایک عذاب، اور اسلام کو شکست دینے کا ایک ہتھیار بن جاتے ہیں۔ ہمارے دشمن ''ایک دوسرے کو بلاتے ہیں، ہم پر حملہ ہونے کے لئے، جیسے کھانا کھاتے ہوئے لوگ دوسروں کو اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔'' (سنن ابوداؤد)

18 مارچ 2004ء کے روز، امریکہ کے ایک بااثر تھنک ٹینک، ''رینڈ کارپوریشن'' نے ایک رپورٹ جاری کی تاکہ اسلام کو مٹا کر اور مغربی سیکولرازم کے سانچے میں ڈھال کر اسے ''مہذب'' بنانے میں مدد فراہم کی جا سکے۔ اس رپورٹ میں جس کا نام ''مدنی جمہوری اسلام: شراکت دار، وسائل، حکمت عملیاں'' ہے، شیرل بینارڈ لکھتی ہے: ''روایت پسندی نہیں بلکہ جدت پسندی مغرب کے کام آئی ہے۔ اس میں یہ ضرورت بھی شامل تھی کہ مذہبی عقیدے کے عناصر سے انحراف کیا جائے، ان میں ترمیم کی جائے اور بعض چنیدہ عناصر کو نظر انداز کر دیا جائے۔''

اسلام کے عناصر میں ''انحراف کرنے، ترمیم کرنے اور چنیدہ عناصر کو نظر انداز کرنے'' کے لئے، بینارڈ ایک سادہ سی حکمت عملی تجویز کرتی ہے: لیبل چپکاؤ، پھوٹ ڈالو، اور کنٹرول کرو۔ مسلمانوں کے ہر گروہ پر لیبل چپکانے کے بعد، وہ تجویز دیتی ہے کہ ایک گرہ کو دوسرے کے خلاف لڑایا جائے۔ دیگر حکمت عملیوں کے ساتھ ساتھ بینارڈ یہ مشورہ بھی دیتی ہے کہ ''روایت پسندوں اور بنیاد پرستوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دی جائے'' اور ''روایت پسندوں اور بنیاد پسندوں کے درمیان اتحاد بنانے کی کوششوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔''

بینارڈ امید ظاہر کرتی ہے کہ اس تقسیم میں کامیابی حاصل کرنے اور ''جدت پسند/ترقی

پسند' مسلمانوں کو سپورٹ کرنے کے بعد ایک ''مدنی جمہوری'' اسلام کو اختراع کرنے کی امید ظاہر کرتی ہے جو پہلے سے کم پسماندہ ہوگا اور کم مسائل کا سبب بنے گا۔ زیادہ مخصوص الفاظ میں، اس کی امید یہ ہے کہ ایک ایسا اسلام تشکیل دیا جائے جو ''نیو کنزرویٹو ایجنڈا'' کے غلبے کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔

لہٰذا اگر اسلام کو مسخ کرنے کی راہ میں پہلا قدم ان لیبلز سے فائدہ اٹھانا ہے جو پہلے سے موجود ہیں، تو ہمیں کہہ دینا چاہئے۔ ''شکریہ، مگر ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' اللہ ہمیں ہدایت کرتا ہے: ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو'' (سورۃ آل عمران: ۱۰۳) لہٰذا اگرچہ ہم ہمیں اور ہمارے دین کو ''مہذب'' بنانے کی ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن آپ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہیں۔ اصلاح صرف اس چیز کی کی جاتی ہے جو بگڑی ہوئی یا فرسودہ ہو۔ اور مرمت اس کی کی جاتی ہے جس میں کوئی خرابی ہو۔

اور اگرچہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ ہمیں ''ماڈرن'' یا ''اعتدال پسند'' کہہ کر بلانا چاہتے ہیں، لیکن ان سطحی چیزوں کے بغیر بھی ہمارا گزارا بخوبی ہو رہا ہے۔ اسلام اپنے آپ میں اعتدال پسند ہے، اس لئے اس کے اصول ومبادی پر ہم جتنے اچھے طریقے سے عمل کریں گے، ہم اتنے ہی زیادہ اعتدال پسند بنیں گے۔ اور اسلام اپنی فطرت میں ابدی اور آفاقی ہے، اس لئے اگر ہم صحیح معنوں میں اسلامی ہیں..... تو ہم ہمیشہ ماڈرن رہیں گے۔

ہم ''ترقی پسند'' نہیں ہیں، ہم ''رجعت پسند'' نہیں ہیں، ''ہم نو سلفی'' نہیں ہیں، ہم ''اسلام پسند'' نہیں ہیں، ہم ''روایت پرست'' نہیں ہیں، ہم ''وہابی'' نہیں ہیں، ہم ''مہاجر'' نہیں ہیں اور ہم ''مقامی'' نہیں ہیں۔ آپ کا شکریہ، لیکن ہم آپ کے دیئے ہوئے سابقوں کے بغیر بھی گزارا کرلیں گے۔

ہم صرف مسلمان ہیں۔

مسلمان بنئے مگر اعتدال کے ساتھ

2004ء میں اپنے پہلے صدارتی مباحثے کے دوران سینیٹر جان کیری رات کا آغاز ''دن کی طرف مائل'' ہونے سے کیا۔ پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے کیری نے کہا کہ امریکہ کو

''شدت پسند اسلامی مسلمانوں'' کو تنہا کرنے کی ضرورت ہے:

''میرے پاس دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے بہتر منصوبہ موجود ہے...... شدت پسند اسلامی مسلمانوں کو تنہا کرنے کے ذریعے، اور یہ کہ انہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو تنہا کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔''

پہلے تو یہ بات خاصی سطحی بلکہ علم و دانش سے عاری محسوس ہوئی۔ ایک مسلم ہوتا ہی اسلام کا ماننے والا ہے، اور اس طرح اصلاً ''اسلامی'' ہی ہوتا ہے۔ ''اسلامی مسلم'' کہنا یہ کہنے کے مترادف تھا: ''امریکی امریکن۔''

تو کیا کیری محض غیر ضروری طور پر بات دہرا رہا تھا؟ یا اس کی بات اس کی سوچ سے زیادہ انکشاف انگیز تھی؟ کیا تم مسلمان ''اسلامی'' ہوتے ہیں؟ سچ یہ ہے کہ نہیں ہوتے۔ کم از کم اچھے مسلمان تو نہیں ہوتے۔

یہ بنیادی مفروضہ شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ اسلام ہی مسئلہ ہے۔ اگر بطور مذہب، اسلام اصلاً شدت پسند ہے تو کوئی چیز جتنی کم ''اسلامی'' ہوگی، اتنا ہی بہتر ہے۔ اور یوں ایک ''اعتدال پسند مسلمان'' ...... سب کو یہ لقب حاصل کرنے کی خواہش رہتی ہے...... محض معتدل حد تک مسلمان اور لہٰذا معتدل حد تک برا ہوتا ہے۔ یہ کہنا اس کے مترادف ہوگا جیسے کسی کو کہہ دیا جائے کہ وہ ''معتدل حد تک سیاہ فام'' ہونے کی کوشش کرے تاکہ وہ زیادہ تشدد پر آمادہ نہ ہو۔ اس کے برعکس، جو مسلمان ضرورت سے زیادہ ''اسلامی'' ہوگا وہ اپنے آپ میں ہی ''شدت پسند ہوگا...... ''ایک شدت پسند اسلامی مسلمان'' ...... اور اس کے ساتھ نمٹنا (یعنی اسے تنہا کرنا) ضروری ہے۔

درحقیقت مونا مے فیلڈ کو ان اصولوں کا بخوبی فہم تھا جب اس نے اپنے شوہر کا دفاع کیا جس پر سپین میں ہونے والے دھماکے میں حصہ لینے کا غلط الزام لگایا گیا تھا۔

''ہمارے گھر میں ایک بائبل ہے۔ وہ کوئی بنیاد پرست نہیں......اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی مختلف اور نہایت منفرد چیز ہے۔'' مے فیلڈ نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو اپنے شوہر کے قبول اسلام

کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے، مے فیلڈ نے اپنے شوہر کی اسلام کے ساتھ وابستگی کی اہمیت کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کی۔ اس نے اس کے قبولِ اسلام کا جواز پیش کرنے کی کوشش بھی کی، جیسے کہ یہ کوئی جرم ہو۔

مسجد کے منتظم شہریار احمد نے مے فیلڈ کا دفاع کرنے کے لئے ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ ''اسے ایک اعتدال پسند شخص کے طور پر دیکھا جاتا تھا'' احمد نے رپورٹروں کو بتایا۔ ''مے فیلڈ ہر جمعے کے روز آخر اپنے جوتے اتارتا، اپنے ننگے پاؤں دھوتا اور قالین پر بیٹھ کر خطبہ سنتا۔ کسی پارسا مسلمان کی طرح وہ روزانہ پانچ وقت مسجد میں آ کر نماز نہیں پڑھتا تھا۔''

اس بات کا مخفی مفہوم یہ ہے کہ برینڈن مے فیلڈ کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کسی طرح سے اس بات سے جڑا ہوا تھا کہ وہ مسجد میں کتنی بار آ کے نماز پڑھتا ہے۔ احمد نے یہ بھی کہہ دیا۔ ''اگر وہ مذہبی تھا بھی تو بہت کم مذہبی تھا۔''

ایک ''قابل قبول'' مسلمان کو کیسا دکھائی دینا چاہئے، اس کے یہ ''کم مذہبی'' نمونے آپ پورے میڈیا میں جابجا دیکھ سکتے ہیں۔ ارشاد منجی، میڈیا کی کارجو اور ''اسلام کے ساتھ مسئلہ'' (The Trouble with Islam) نامی کتاب کی مصنفہ، ان نمونوں میں سے سب سے زیادہ مقبول ہے۔ منجی کی تحاریر وسیع پیمانے پر شائع کی گئی ہیں اور وہ تمام بڑے میڈیا چینلوں پر نمودار ہو چکی ہے۔ اس ''ہمت'' دکھانے پر اوپرا ونفری کا ''کت سپا ایوارڈ'' (Chutzpah Award) بھی مل چکا ہے۔

اگرچہ منجی خود کو ایک ''مسلمان انکاری'' بتاتی ہے، مگر میڈیا اسے ایک مثالی ''پابند شریعت مسلمان'' کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف پیس کا ایک بورڈ ممبر، ڈینئل پائپس اسے ''باحوصلہ، اعتدال پسند، جدید مسلمان'' قرار دیتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ منجی کے افکار کا اسلام سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ پائپس کے افکار کا امن سے ہے۔ واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والا ایک مضمون اسلام کے اہم ترین رکن نماز کے بارے میں منجی کے ''الہام'' کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''اس نے کہا کہ اس کے بجائے اس نے اپنے طور پر نماز ادا کرنا شروع کر دیا۔ اپنے پاؤں، بازو اور چہرہ دھونے کے بعد وہ ایک مخملیں قالین پر بیٹھ جاتی اور مکہ کی طرف رخ کر لیتی۔ رفتہ رفتہ، اس نے یہ کرنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ ''اندھی غلامی اور داخل عادت عاجزی'' کی عادی نہیں ہونا چاہتی تھی۔''

پوری دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے معمول کے متعلق منجی کو اپنی رائے رکھنے کی آزادی ہے۔ اسے یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ اگر چاہے تو ان میں سے کوئی یا چاہے تو سارے ارکان کو چھوڑ دے۔ مگر منجی کو ایک ایسی غیر اہم عورت کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا، جس نے ایک روز نماز نہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے دین...... جب تک کہ یہ دین اسلام ہو، کوئی اور نہ ہو...... کے مرکزی ارکان کو ترک کرنے کے اس کے فیصلے کو آزادی کے لئے ایک جنگ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جبر کے خلاف جنگ۔ وہ ''باحوصلہ'' اور ''باہمت'' ہے، اور دوسرے ''کم اسلامی'' مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ برائے تقلید۔

اس چیز کو نمونہ بنانے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سے کہا جائے کہ وہ ''زیادہ سیاہ فام'' یا ''زیادہ یہودی'' نہ بنے جیسے یہ لوگ اصلاً برے اور متشدد ہوتے ہیں اور جو کوئی ''اعتدال کی حد تک سیاہ فام'' اور ''اعتدال کی حد تک یہودی'' بننے کی کوشش کرے گا وہ آزادی کا مجاہد ہوگا۔ مثال کے طور پر منجی نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا: ''تشدد تو ہونا ہی ہے، تو پھر آزادی کی خاطر تشدد کا خطرہ کیوں نہ مول لیا جائے؟''

ہاں، آزادی ایک اچھی چیز ہے۔ منجی اسے زیادہ بہتر الفاظ میں بیان کر سکتی تھی۔ کیری زیادہ لطیف الفاظ استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن جو بات کیلی فورنیا کے امپیریئل ویلی کالج کے ایک بزنس مینجمنٹ کے پروفیسر نے کہی، وہ زیادہ سچ ہے: ''اسلامی دہشت گردی کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مذہب اسلام کو ہی ختم کر دیا جائے۔''

لیکن آپ بات خواہ کسی بھی انداز میں کہیں، ایک چیز یقینی ہے: آج کل جب بات اسلام کی آتی ہے تو تھوڑا بھی یقیناً بہت ہوتا ہے۔

ناقابلِ بیان سانحہ اور ہماری امت کی حالت

میرے خیال میں انسانی ذہن میں ایک جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں جا کر ہم چھپ جاتے ہیں، اس وقت جب ہمارے پاس جانے کے لئے اور کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ہر انسانی دل کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں ہم ہمیشہ ناقابلِ تصور سانحے کے گرد بے سکون رہتے ہیں۔ تاہم آج شام اور فلسطین کے لوگوں کے لئے، یہ سانحہ محض ذہن یا دل کا ایک تصور نہیں رہا بلکہ ان کے لئے واحد معلوم حقیقت بن گیا ہے۔

بے بسی کے عالم میں کھڑے ان سرزمینوں میں ہونے والی قتل و غارت کو دیکھتے ہوئے میں خود کو اس حوالے سے غیر یقینی کیفیت کی شکار پاتی ہوں کہ میں کہاں جاؤں۔ میں اپنے ذہن میں ایک جگہ تلاش کرتی ہوں، ایسی جگہ جہاں میں ناقابلِ فہم کو سمجھ سکوں اور یہ تصور کر سکوں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہو رہا۔ میں غم و حزن، طیش اور یاسیت کے درمیان چکراتی رہتی ہوں لیکن آخر میں، میں ایک مسلسل چبھنے والے سوال کی طرف لوٹ آتی ہوں۔

کیوں؟

ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ساری دنیا میں ہم پر مصائب کے پہاڑ کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ ہم اسے روکنے میں اتنے بے بس کیوں ہیں؟ ہم سیاسی طور پر اسی ملک میں اتنے بے اختیار کیوں ہیں جس کے ہم شہری ہیں؟ یہ کیوں ہوتا ہے کہ ہم حلق کے بل چلاتے ہیں، خطوط لکھتے ہیں اور وائٹ ہاؤس میں نمائندوں کو بلاتے ہیں، مگر ان کی طرف سے ایسے ہی جواب سننے کو ملتے ہیں: ''اسرائیل کو اپنا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے''؟ ہم اس مقام پر کیوں ہیں؟ کیوں؟

ہمیں پوچھنا ہوگا کہ کیوں۔

ہمیں رک کر حقیقی معنوں میں جائزہ لینا ہوگا کہ ایک امت کے طور پر ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہم کیا بن گئے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ مسلمانوں کو پوری دنیا میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، ایک وقت تھا جب ہمارے دوست ہم سے محبت کرتے تھے اور ہمارے دشمن ہم سے خوف کھاتے تھے۔ آج ہم دنیا کا سب سے مظلوم، بدنام اور نفرت کی نگاہ سے دیکھے جانے والا

گروہ بن گئے ہیں۔ ایک حالیہ گیلپ پول میں، آدھے سے زیادہ امریکیوں نے کہا کہ اسلام کے بارے میں ان کی رائے ''بالکل اچھی نہیں'' ہے، اور 43 فیصد نے اعتراف کیا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ''تھوڑا سا'' تعصب موجود ہے...... عیسائیوں، یہودیوں اور بدھوں کے حوالے سے ایسا تعصب رکھنے والوں کی تعداد اس کے نصف سے بھی کم تھی۔

تاہم، ہم سے صرف نفرت نہیں کی جاتی۔ کئی جگہوں پر ہمیں ایذائیں پہنچائی جا رہی ہیں، موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے، اور ہمارے مال و متاع سے محروم کیا جا رہا ہے۔ جب ہمیں جسمانی طور پر نشانہ نہیں بنایا جاتا، وہاں ہمارے حقوق چھین لئے جاتے ہیں، ہم پر جھوٹے الزام لگائے جاتے ہیں، اور ہمیں غلط الزاموں کے تحت قید بھی کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی نفرت اتنی گہری ہو گئی ہے کہ انٹی مسلم بیانات قابل قبول منتخب تعصب کی حیثیت حاصل کر گئے ہیں۔ انہیں اس حد تک قبول کیا جاتا ہے کہ بعض لوگ سیاسی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے بھی انہیں استعمال کرتے ہیں۔

بطور امت ہمیں جو یہ صورتِ حال درپیش ہے، اسے چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا: ''جلد ہی لوگ تم پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک دوسرے کو بلانا شروع کر دیں گے جیسے کھانا کھاتے ہوئے کوئی دوسروں کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔'' کسی نے سوال کیا: ''کیا اس وقت ایسا ہماری قلیل تعداد کی وجہ سے ہوگا؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا: ''نہیں، تمہاری تعداد اس وقت بہت زیادہ ہوگی، لیکن تمہاری مثال سمندر کی جھاگ کی طرح ہوگی جسے پانی بہا لے جاتا ہے، اور اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف نکال دے گا، اور تمہارے دلوں میں ''الوھن'' ڈال دے گا۔'' کسی نے دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! ''الوھن'' کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا۔ ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔'' (ایک صحیح حدیث جو سنن ابوداؤد اور مسند احمد دونوں میں ملتی ہے۔)

بالکل ویسے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش گوئی کی تھی، لوگ واقعی ہم پر حملہ آور ہونے کے لئے دوسروں کو بلا رہے ہیں، جیسے کوئی دوسروں کو کھانے میں شریک ہونے کی

دعوت دیتا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سمندر کی جھاگ کے طور پر بھی بیان فرمایا ہے۔ اگر آپ سمندر میں لہروں کو بہتا ہوا دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان کے اوپر نظر آنے والی جھاگ کی پتلی سی تہہ بالکل بے وزن اور تقریباً بے وجود ہوتی ہے، ہلکی سی ہوا بھی اس کا نام ونشان مٹا سکتی ہے۔ اس میں اتنی قوت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے راستے کا تعین کر سکے۔ اس کے بجائے پانی اسے جہاں جہاں لئے پھرتا ہے، یہ بہی چلی جاتی ہے۔

یہ ہماری حالت ہے، جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا تھا۔ تاہم، ہمیں ''کیوں'' کے سوال کی طرف واپس آنا ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں اس سوال کا واضح جواب دیتے ہیں۔ آپ ﷺ وضاحت فرماتے ہیں کہ دلوں میں ''الوھن'' بھرا ہوگا۔ جب اس لفظ کے بارے میں پوچھا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند ایسے الفاظ میں جواب دیا جن میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت'' ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسی قوم کا احوال بیان کیا ہے جو اس زندگی میں اتنی مشغول ہو چکی ہے کہ خود غرض، مادہ پرست، کوتاہ بیں، اور اللہ سے اپنی ملاقات سے غافل ہو چکی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک ایسی قوم کا احوال بیان کیا جو اتنی دنیا پرست ہوگئی ہے کہ اپنے اخلاقی کردار سے ہی محروم ہوگئی ہے۔

اس اخلاقی کردار کے تحت ہی کسی قوم کی حالت تبدیل ہوتی ہے، خواہ اچھے سے برے کی طرف ہو یا برے سے اچھے کی طرف۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں آگاہ کرتا ہے:

> ''کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔'' (سورۃ الرعد:۱۱)

لہٰذا کردار کی وجہ سے ہی ایک قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ عالمی سپر پاور کے مقام سے گر کر سمندر کی جھاگ جیسی بن جاتی ہے۔ اور دلوں اور کردار کو بدلنے سے ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ جو ایک وقت میں سمندر کی جھاگ جیسے تھے، پھر سے زور آور بن جائیں۔

لہٰذا ہمیں بطور مسلمان کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اللہ نے اپنے دین کی اعانت اور فتح کا وعدہ کر رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں اور آپ اس کا حصہ ہوں گے۔ اللہ

سبحانہ وتعالیٰ ہمیں قرآن میں یاد دلاتا ہے:

''کمزور نہ پڑو اور غم نہ کرو، اور تم ہی غالب آؤ گے، اگر تم مومن ہو۔''

(سورہ آل عمران: ۱۳۹)

مخلصانہ ایمان اور جدوجہد کی بدولت ہی اللہ ہماری حالت میں تبدیلی لائے گا۔ اس لئے ان کی خاطر جن کا خون شام اور فلسطین میں، اور پوری دنیا میں، بہہ رہا ہے، ہمیں بطور امت بیدار ہونے اور اللہ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

آج بحیرۂ احمر کا شق ہونا: مصر کے بارے میں خیالات

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بحیرۂ احمر کے کنارے پر کھڑے تھے اور پیچھے سے ایک جابر بادشاہ اپنی فوج لئے آ رہا تھا تو ان کی قوم کے کچھ لوگ انتشار کے شکار ہونے لگے۔ سامنے نگاہ ڈالنے پر ان لوگوں کو صرف شکست نظر آئی:

''پس جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں نے کہا: ہم یقیناً پکڑے گئے۔'' (سورہ الشعراء: ۶۱)

لیکن موسیٰ علیہ السلام کی نگاہیں مختلف تھیں۔ آپ کی نگاہیں روحانی نگاہیں تھے جو دنیاوی سختی اور شکست کے پار دیکھتی تھیں۔ انہیں سب سمجھ آ رہی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے جڑے ہوئے دل کے ساتھ، اسی ناممکن صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے، موسیٰ علیہ السلام کو صرف اللہ کی ذات نظر آئی:

(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا: ہرگز نہیں! میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راہ دکھائے گا۔'' (سورہ الشعرا: ۶۲)

''ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی بھیجی کہ دریا پر اپنی لاٹھی مارو پس اس وقت دریا پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ پانی کا مثل بڑے پہاڑ کے ہو گیا۔ اور ہم نے اسی جگہ دوسروں کو نزدیک لا کھڑا کر دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہم نے نجات دی۔ پھر اور سب دوسروں کو ڈبو دیا۔'' (سورہ الشعرا: ۶۶-۶۳)

آج مصر میں ہم ایک بحیرۂ احمر کے سامنے کھڑے ہیں۔ آج مصر میں، ایک آمر اور اس کی فوج ہماری پشت پر ہیں۔ آج، کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں صرف شکست نظر آ رہی ہے۔ تاہم، دوسرے بھی ہیں جن کی آنکھیں راہ میں کھڑی رکاوٹ کے پار نظر آنے والی امید کو دیکھ رہی ہیں۔ آج مصر میں ایسے لوگ ہیں جن کی پشت پر آمر کھڑا ہے لیکن پھر بھی وہ کہہ رہے ہیں:

''بے شک میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے راہ دکھائے گا۔''

انسان سوچ سکتا ہے کہ تاریخ کے ایسے نازک موڑ پر ہم ایک قدیم داستان کیوں بیان کریں گے۔ جو واقعہ آج سے ہزاروں سال پہلے وقوع پذیر ہوا، آج کے حالات سے اسے کیا نسبت ہے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ محض ایک قصہ نہیں ہے۔ نہ ہی یہ قدیم ہے۔ یہ ایک ابدی نشانی ہے اور تمام زمانوں کے لئے ایک سبق ہے۔ اگلی ہی آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

''بے شک اس میں ایک نشانی ہے، لیکن ان میں سے زیادہ تر ایمان والے نہیں۔'' (سورہ الشعرا: ٦٧)

یہ خدا کی حقیقت اور دنیا کے رازوں کی ایک نشانی ہے۔ یہ ایک نشانی ہے کہ جبر کبھی فتح نہیں پاتا اور یہ کہ رکاوٹیں محض نظر کا دھوکا ہیں جنہیں ہماری آزمائش کرنے کے لئے، ہماری تربیت کرنے کے لئے اور ہمارا تزکیہ کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ اس بات کی نشانی ہے کہ کامیابی کہاں سے عطا ہوتی ہے۔ اور یہ اس کا ایک منظر ہے کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود...... ایک ایسے وقت میں جب ہم خود کو پھنسا ہوا، شکست خوردہ اور لاچار محسوس کر رہے ہوتے ہیں...... یہ کامیابی دیکھنے میں کیسی لگتی ہے۔

کچھ لوگ سوال کر سکتے ہیں اگر واقعی ہم حزب اللہ میں سے ہیں تو ہمیں آسانی سے فتح کیوں حاصل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ سوچ سکتے ہیں کہ اللہ نیک لوگوں کو زبردست جدوجہد اور قربانیوں کے بغیر فتح کیوں عطا نہیں کر دیتا۔ اللہ نے اس سوال کا جواب بھی دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے رہنے

والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں نہ پکڑا ہوتا کہ گڑ گڑائیں۔''

(سورہ الاعراف:۹۴)

یہاں اللہ فرماتا ہے کہ مصیبت کا مقصد ''تــضــرعــو'' کی کیفیت حاصل کرنا ہے۔ ''تــضــرعــو'' کے معنی ہیں اللہ کے سامنے عاجزی...... مگر یہ محض عاجزی تک محدود نہیں۔ ''تضرعو'' کے تصور کو سمجھنے کے لئے، تصور کیجئے کہ آپ ایک سمندر کے بیچ ہیں۔ تصور کیجئے کہ ایک کشتی میں آپ بالکل تنہا ہیں۔ تصور کیجئے کہ ایک زبردست طوفان آتا ہے اور لہریں آپ کے اردگرد پہاڑوں کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ اب تصور کیجئے کہ اس موقعے پر آپ اللہ کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس کی اعانت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ آپ حاجت، مرعوبیت، انحصار اور کامل عاجزی کی کس کیفیت میں ہوں گے؟ یہ ''تضرعو'' ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ ہمیں تحفہ عطا کرنے کے لئے وہ مصائب پیدا کرتا ہے۔ اللہ کو ہمارے لئے مشکلات پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ایسے حالات اس لئے پیدا کرتے ہیں تاکہ ہم اس کے تقرب کی کیفیت کو پہنچ سکیں، جس تک بصورتِ دیگر پہنچنا محال ہوگا۔

عاجزی، تقرب اور اللہ پر کامل انحصار کی یہی انمول کیفیت ہے جو آج مصر کے لوگوں کو حاصل ہوگئی ہے۔ اللہ اکبر! لیکن اللہ ان مشکلات اور کشاکشوں کا ایک اور مقصد بھی بیان کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔ بعض ان میں نیک تھے اور بعض ان میں اور طرح کے تھے اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔''

(سورہ الاعراف:۱۶۸)

سورۂ آلِ عمران (آیات ۱۴۰ تا ۱۴۲) میں ارشاد ہوتا ہے:

''''اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو وہ لوگ بھی تو ایسے ہی تکلیف پا چکے ہیں، ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں، اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کردے اور تم میں سے بعض کو

شہادت کا درجہ عطا فرمائے اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ یہ بھی وجہ تھی کہ اللہ ایمان والوں کا تزکیہ کردے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔"

یہاں اللہ مشکلات کا مقصد بیان کرنے کے لئے "تمحیص" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ [تم]حیص" کا لفظ سونے کو تپانے اور خالص بنانے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تپایا نہ [جائ]ے تو سونا قیمتی تو ہوتا ہے لیکن کھوٹ سے بھرا ہوتا ہے۔ "تمحیص" کر کے سونے سے کھوٹ [نکا]ل دیا جاتا ہے۔ اللہ مومنوں کو بھی اسی عمل سے گزارتا ہے۔ مشکلات کی بدولت، سونے کی [ط]رح، مومنوں کی آلائشیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔

اب یہ نوجوان آمریت کو للکارتے ہوئے سڑکوں پر کھڑے ہیں، گھٹنوں کے بل بیٹھے [نما]زیں پڑھ رہے ہیں، اور ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اپنے رب کو پکار رہے ہیں۔ وہی لوگ [ص]رف چند دن پہلے تک بمشکل ہی نماز پڑھا کرتے تھے، آج فوج کے ٹینکوں کے سامنے [کھ]ڑے ہو کر اپنے خالق کے حضور جھک رہے ہیں۔ اس بغاوت کے شروع ہونے سے محض [چن]د دن پہلے تک، مصری مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشیدگی تاریخ کی بلند ترین سطح تک [پہن]چ چکی تھی۔ آج مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کے، اور اپنے ملک کے، دفاع میں شانہ [بشا]نہ کھڑے ہیں۔ وہی لوگ ایک دن پہلے تک، اپنے تپائے جانے سے پہلے، ایک دوسرے پر [وا]ر نہ کرتے تھے، اب بھائیوں اور بہنوں کی طرح اکٹھے ہو گئے ہیں، جسد واحد بن گئے ہیں [تاک]ہ اپنی گلیوں، اپنے گھروں اور اپنے محلوں کا دفاع کر سکیں۔ اور اس مشکل کے ذریعے، ایک [ش]خص جو محض اپنے موبائل فون، شیشہ، اور سگریٹ کے لئے زندہ تھا، اب اپنی قوم کی آزادی [کے] لئے اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

اللہ قرآن میں ہمیں بتاتا ہے:

آپ کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا

وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ یہی کہیں گے کہ ''اللہ'' تو ان سے کہئے کہ پھر تقویٰ کیوں اختیار نہیں کرتے۔'' (سورۂ یونس:۳۱)

اللہ ہی ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔ اسی نے ہمیں مردے سے زندہ کیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی گمان نہ کیجئے گا کہ اس کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا ہے جو کسی مقصد کے بغیر ہو رہا ہے..... کسی گہرے، دوررس، اور خوبصورت، آزادی عطا کرنے والے مقصد کے لئے۔ دہائیوں سے مصری عوام خوف کی زندگی جیتے آ رہے تھے۔ لیکن جب آپ خوف کو اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں تو آپ غلام بن جاتے ہیں۔ اللہ نے مصری قوم کو اپنے سب سے بڑے خوف کا سامنا کرنے اور اس پر غالب آنے پر آمادہ کر کے اس غلامی سے نجات دے دی ہے۔ مصری قوم کو یہ موقع دے کر کہ وہ آمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں اور اس سے اور پوری دنیا سے کہیں کہ وہ اب خوف میں زندہ نہیں رہیں گے، اللہ نے انہیں آزادی عطا کر دی ہے۔ اور اب لہٰذا مبارک رہے یا جائے، زندہ رہے یا مر جائے، اس سے حقیقی معنوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مصری قوم پہلے ہی آزادی حاصل کر چکی ہے۔ انہیں آزادی عطا کر دی گئی ہے۔

حسنی مبارک غیر اہم ہے۔ وہ ایک آلے کے سوا کچھ نہیں، ایک ایسا آلہ جسے استعمال کرتے ہوئے اللہ مصری قوم کے لئے اور پوری امت کے لئے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہا ہے۔ ایک ایسا آلہ جسے استعمال کرتے ہوئے، اللہ مصری عوام اور امت کا تزکیہ کرنے، انہیں سعادت بخشنے، اور آزادی عطا کرنے کا منصوبہ مکمل کر رہا ہے۔ اور یہ بات غیر اہم ہے کہ آج ہم مصر میں ہیں یا نہیں۔ مصر ہمارے جسم کا صرف ایک عضو ہے۔ مصر کا تزکیہ پوری امت کے جسم کا تزکیہ ہے۔ یہ آپ کا اور میرا تزکیہ ہے۔ یہ موقع ہے کہ ہم خود سے سوال کریں کہ ہماری وابستگی کس سے ہے۔ ہم کس سے خوفزدہ ہیں؟ ہم کس چیز کے لئے کوشش کر رہے ہیں؟ ہم کس مقصد کے لئے کھڑے ہیں؟ اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟

جب جسم نہایت گہری نیند کے عالم میں ہوتا ہے..... کوما میں ہوتا ہے..... تو اللہ کی لامحدود رحمت کی بدولت ہی ہمیں بیداری کا اذن ملتا ہے۔ اپنی لامحدود رحمت کی بدولت وہ وہاں ہمیں زندگی عطا کرتا ہے جہاں پہلے صرف موت کا راج تھا۔ ہم غافل تھے، اس لئے اس نے ایک نشانی بھیجی۔ ہم سوئے ہوئے، لہٰذا اس نے ہمیں بیدار کر دیا۔ ہم اس زندگی کی پرستش میں مبتلا تھے، اور اپنے دنیاوی اسباب کو ترجیح دیتے تھے، بجائے اس کے کہ اس روح کو آزاد کرائیں جو اللہ سے جڑی ہوئی ہو اور اس کے سوا کسی سے خوفزدہ نہ ہو..... لہٰذا اس نے ہمیں آزاد کر دیا۔

کتنے لوگوں کو اپنی زندگی میں اس طرح کا تجربہ ہوگا؟ کتنے لوگ ایک سمندر کو شق ہوتے ہوئے اور ایک آمر کو رسوا ہوتے ہوئے دیکھیں گے؟ کیا ہمیں خود سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہئے کہ یہ منظر دیکھنے کے لئے ہمیں ہی کیوں چنا گیا؟ کیا ہمیں خود سے دریافت نہیں کرنا چاہئے کہ ہم کیا سبق سکھانا، ہم میں کون سی تبدیلی لانا، ہماری کیسے کایا کلپ کرنا مقصود تھا؟ کیونکہ اگر ایک لمحے کے لئے بھی ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ یہ سب صرف مصری قوم کے بارے میں ہے، تو ہم بات کو سمجھنے میں بری طرح سے ناکام ہو رہے ہیں۔ ہم سوئے ہوئے تھے، اللہ نے ہمیں بیدار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم مرے ہوئے تھے اور اللہ ہم میں جان ڈالنا چاہتا ہے۔

ہمیں اس یقین کا خوگر بنا دیا گیا تھا کہ ہمارا دشمن ہماری ذات سے باہر ہے۔ یہ کہ اس کا ہم پر زور چلتا ہے۔ یہ بھی ایک واہمہ ہے۔ دشمن ہمارے اندر ہی ہے۔ یہ سارے خارجی دشمن تو ہمارے اپنے امراض کے مظاہر ہیں۔ اور اگر ہم ان دشمنوں پر غالب آنا چاہتے ہیں، تو پہلے ہمیں اپنے اندر چھپے بیٹھے دشمن پر غالب آنا ہوگا۔ اسی لئے قرآن ہمیں بتاتا ہے:

"کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے۔" (سورۃ الرعد: ۱۱)

ہمیں پہلے لالچ، خودغرضی، شرک، سب سے بڑے خوف، اللہ کے علاوہ کسی بھی اور چیز کی محبت، اس سے امید اور اس پر انحصار پر غالب آنا ہوگا۔ ہمیں دنیا کی محبت پر غالب آنا ہوگا جو ہمارے تمام امراض اور تمام مصائب کی جڑ ہے۔ اپنی زندگیوں میں فرعون کو شکست دینے

سے پہلے، ہمیں اپنے اندر چھپے بیٹھے فرعون کو شکست دینا ہوگی۔ اس مصر میں ہونے والی جنگ آزادی کی جنگ ہے۔ ہاں۔ لیکن آزادی کس سے؟ کون حقیقی معنوں میں مجبور و مقہور ہے؟ کیا میں اور آپ آزاد ہیں؟ حقیقی جبر کیا ہے؟ ابن تیمیہؒ اس سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں، جب وہ یہ کہتے ہیں: ''(حقیقی معنوں میں) قیدی وہ شخص ہے جس کا دل اللہ سے دوری کی قید میں ہو، اور غلام وہ ہے جسے اس کی خواہشوں نے غلام بنا رکھا ہو۔'' (ابن القیم، الوابل)

جب آپ اندر سے آزاد ہوتے ہیں تو پھر کسی کو اپنی آزادی چھیننے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور جب آپ کے پاس باطن کی آزادی ہو تو آپ جابر حکمرانوں اور بدمعاشوں سے ماورا، ان حکمرانوں اور بدمعاشوں کے رب کو دیکھ سکتے ہیں۔ جب آپ اندر سے آزاد ہوتے ہیں تو آپ کو غلام بنانا ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ آپ اسی شخص کو غلام بنا سکتے ہیں جس کی ذات کے ساتھ وابستگیاں جڑی ہوں۔ آپ صرف اسی شخص کو دھمکا سکتے ہیں جو نقصان سے خوفزدہ ہو۔ آپ کا زور کسی پر اسی وقت چلتا ہے جب اسے کسی ایسی چیز کی ضرورت یا خواہش ہو جسے چھیننے کی آپ طاقت رکھتے ہوں۔ لیکن صرف ایک ہستی ایسی ہے جسے آپ سے چھیننے کی طاقت کسی انسان میں نہیں، اور وہ ہے آپ کا رب۔

اور لہٰذا جب مصر کو آزاد کرانے کی جنگ لڑتے ہیں تو ایک زیادہ بڑے اور زیادہ حقیقی پیمانے یہ خود ہمیں آزاد کرانے کی جنگ بھی ہے۔ یہ اپنے نفس اور خواہشات کی محکومی سے خود کو آزاد کرانے کی جنگ ہے۔ جھوٹی وابستگیوں اور آسروں سے خود کو آزاد کرانے کی، ان سب چیزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جنگ ہے جو ہمیں کنٹرول کرتی ہیں، ان سب چیزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جنگ ہے جن کی ہم ماسوا اللہ کے پرستش کرتے ہیں۔ یہ ہمیں خود اپنی غلامی سے آزاد کرانے کی جنگ ہے۔ ہم امریکی ڈالر کے غلام ہوں، اپنی خواہشات، مقام و مرتبے، مال و دولت یا خوف کے غلام ہوں، مصر کا تزکیہ ہم سب کا تزکیہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ہمیں حقیقی کامیابی کا جو کلیہ بتایا گیا ہے، اس کے دو اجزاء ہیں: صبر اور تقویٰ:

''اے ایمان والو! تم ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور

جہاد کے لئے تیار رہو تا کہ تم مراد کو پہنچو۔'' (سورۂ آلِ عمران: ۲۰۰)

اس لئے اگر ہم آج کے مصر کو یوں دیکھیں جیسے یہ محض کوئی تماشا ہے جو ہماری ذات سے باہر ہو رہا ہے، اپنا تزکیہ اور تجزیہ نہ کریں، اور حقیقی معنوں میں خود کو اور اپنی زندگیوں کو نہ بدلیں، تو ہم اس کے مقصد کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔

روز روز تو ایسا نہیں ہوتا کہ ایک سمندر ہماری نگاہوں کے سامنے شق ہو جائے۔

☆☆☆

شاعری

آپ کے نام ایک خط

آزادی کی وضاحت کرنا دشوار ہے۔ یہ نہایت گہری اور نہایت حقیقی ہوتی ہے۔ کنفیوژن کے پار، خالی ڈبوں اور کھوکھلی شبیہوں کے پار، اے دنیا، میں نے تجھے دیکھا۔ تو میری آنکھوں پر ایک کے بعد ایک پردہ ڈالتی ہے۔ مجھ پر غالب آنے کی، مجھے دھوکہ دینے، مجھے اپنے کذب و افترا کا غلام بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

جبکہ سچ یہ ہے کہ جب میں تیرے دروازے پر فریاد لے کر آئی تو تو مجھے پانی کی ایک بوند بھی نہ دے سکی۔ میں مضطر ہو کے تیرے سامنے جھک گئی کہ تو میری تشنہ لبی کا مداوا کرے۔

جو مجھے اب نظر آتا ہے وہ اس شفافیت کی ایک جھلک ہے جو دائمی مایوسی کی بدولت ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور میں یہاں تیرے غنڈوں، تیرے جھوٹوں کی فوج میں گھری بیٹھی ہوں جنہیں مجھے پابہ زنجیر کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن اب میں تیری قید میں نہیں رہوں گی۔ میں اب وہ چھوٹی سی بچی نہیں رہوں گی جو راتوں کو جاگ جاگ کر تیرے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ میں اب وہ دل شکستہ بچی نہیں ہوں جو تیرے لئے بے سود آنسو بہاتی تھی۔ میری یک طرفہ محبت اب مجھے توڑ نہیں سکتی۔ تو مجھے توڑ نہیں سکتی۔ میں تیری چمک دمک اور جھوٹے وعدوں کے سامنے جھکوں گی نہیں۔ میں اب وہ وفادار کنیز نہیں رہی جو تیرے نقلی تخت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔ اب میرے آنسو تجھ پر ضائع نہیں ہوں گے۔ اور میرا دل اب تیری پناہ گاہ نہیں ہے۔

اب تو یہاں نہیں رہ سکتی۔

یہاں آنے کے لئے میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔ بعض اوقات ایسے ایسے صحرا آئے جہاں میری واحد ضرورت پانی کی ایک بوند کی تھی، جو تو دے نہ سکی۔ بعض اوقات طوفان آئے جہاں میری واحد ضرورت روشنی کی ایک کرن کی تھی جو مجھے راستہ دکھائے، اور میں نے بار بار تجھ سے سوال کیا، اس چیز کے لئے جو تو دے ہی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ تیرے پاس دھوم دھڑکے،

لاف گزاف اور دھوکوں کے اثاثے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور اس لئے میں نے بار بار خود کو بے آب صحراؤں میں پایا، بے نور اندھیروں میں پایا۔ مگر اب میں تیری غلام نہیں رہی، کیونکہ ایک ہستی مجھے اس غلامی سے آزاد کرانے کے لئے آئی۔ ایک ہستی جو مجھے غلام کی غلامی سے آزاد کرانے اور مجھے غلام کے آقا کی بندگی میں دینے کے لئے آئی۔

میں غم مناتی ہوں

میں نے اپنا سر اٹھایا
ایک بار پھر
پر صرف یہ دیکھا
کہ سورج ڈوب چکا ہے
درخت سو چکے ہیں
اور وہ سب گھر چلے گئے ہیں
میں غم مناتی ہوں۔
آسمان جو صاف تھا
اب دھند سے آلودہ ہے۔
میرا رستہ اب نگاہوں سے اوجھل ہے۔
کوشش بھی کیوں کروں...... جب ہر چیز اتنی دھندلی ہے؟
میں غم مناتی ہوں۔
آج میں غم مناتی ہوں
اس کا جو کھو گیا
میرے فراموش کردہ لوگ
اب بھی گھٹنوں کے بل بیٹھے ہیں
بہار کے موسم میں ایک برفیلے دیوتا کے سامنے
میں غم مناتی ہوں

انہیں وہ دعا یاد نہیں رہی
اور یہ بھی نہیں کہ انہیں کس کو پکارنا چاہیے
جو ہر کی جگہ لے لی ہے
دنیاوی رسم و رواج نے،
کھوکھلی علامات نے۔
ان کے دل...... اتنے مضمحل،
واماندہ اور خستہ حال
میں غم مناتی ہوں۔
ہم وہ قوم ہیں
جس نے شکست کھائی...... مگر مفتوح نہ ہوئی
اور کسی نہ کسی طرح سے
میں اپنے خون کو لوٹتا محسوس کرتی ہوں۔
میں کھڑی ہوں گی۔
میں کوشش کروں گی۔
اور اپنے غم سے آگے بڑھ کے،
میں دیکھوں گی......
یہ وہ قوم ہے جسے تم غلام نہیں بنا سکتے۔
ایک وفاداری ہے...... جسے تم خرید نہیں سکتے۔
کیونکہ ایک زمین پر قبضہ ہو سکتا ہے......
لیکن روح پر کبھی نہیں۔
اپنے آنسوؤں سے آگے بڑھ کر
میں سمجھوں گی۔
آج میری قوم روتی ہے۔

لیکن کل...... موت کو موت آ جائے گی،
جب ان کے آنسو ایک ایسی سرزمین کو جنم دیں گے
جہاں...... "نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔" (سورہ البقرہ: ۲۶۲)

صرف میرے خیالات

آج ایک عجیب سی اداسی ہے۔ ایسی اداسی نہیں جو آپ کو خالی خالی سا یا تنہا تنہا سا یا حتیٰ کہ خود کو ناکافی سا محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ ساکت سی اداسی ہے، ایسی اداسی جو تفہیم کے، بلکہ قبولیت کی ایک خاص سطح کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

آج میں نے اس تصویر کو دیکھا، اور جتنی بار بھی دیکھا، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ ساحل سمندر پر غروبِ آفتاب کی تصویر تھی۔ دم بخود کر دینے والی۔ اور اس کے اوپر یہ آیہ مبارکہ تحریر تھی:

"اللہ نے یہ سب بے سبب پیدا نہیں کیا، پاک ہے اس کی ذات۔"

اور یہی بات تھی۔ ساری کی ساری۔ اداسی، حادثات، مسکراہٹیں، سکون، تکلیف، محبت، محرومی، اور قربانی: یہ سب بے سبب نہیں ہے۔ بے مقصد نہیں ہے۔ یہ کوئی غلطی نہیں ہے، کوئی بھول چوک یا واقعات کا کوئی اتفاقی سلسلہ نہیں ہے۔

میں نے اس تصویر کو دیکھا اور اچانک بھولی بسری یادوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایک ایسے وقت کی یادیں جو مجھے بالکل یاد نہیں۔

"اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا
اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟
سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں، تاکہ تم لوگ
قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔"
(سورہ الاعراف: ۱۷۲)

کسی سے محرومی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اپنے رب سے محرومی کا۔ اس کے قرب سے محرومی کا۔ ایک ایسے وقت سے محرومی کا جو کبھی تھا یا کبھی ہوگا۔ ایک وقت جو اتنا یقینی

ہے، کہ لگتا ہے آ کے گزر بھی چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ قرآن میں اخروی زندگی کے بارے میں بات کرتا ہے تو ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

جب آپ کو کوئی فن پارہ پسند آتا ہے تو آپ فنکار سے ملنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں بحرالکاہل پر غروبِ آفتاب، سمندر سے ابھرتے پورے چاند، ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نظر سے بادلوں، ''رالی'' (Raleigh) کے خزاں کے جنگلات اور پہلی برف باریوں کے نگارخانوں کی طالبہ ہوں۔

اور میں فنکار سے ملنے کو بے تاب ہوں۔

''اس روز کچھ چہرے بارونق ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' (سورہ القیامت: ۲۳۔۲۲)

محبت کے بارے میں ایک خیال

یہ ساری محبت۔ ہر جزو۔ ساری دنیا کی محبت کا ہر حصہ۔ وہ محبت جس کے ساتھ وہ نظمیں بناتے ہیں۔ مسحور کن ناولوں کی محبت۔ نغموں میں محبت۔ محبت جس کی عکاسی انہوں نے ایک فلم میں کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بچے کے لئے ایک ماں کی محبت، اپنے باپ کے لئے ایک بچی کی محبت۔ وہ محبت جو آزاد کرتی ہے۔ وہ محبت جو غلام بناتی ہے۔ وہ محبت جو آپ حاصل کرتے ہیں۔ وہ محبت جو آپ کھو دیتے ہیں۔ وہ محبت جس کے پیچھے آپ بھاگتے ہیں۔ وہ محبت جس کے لئے آپ زندہ رہتے ہیں۔ وہ محبت جس کے لئے آپ کو پتہ ہے کہ آپ جان بھی دے سکتے ہیں۔ وہ محبت جو مردوں کو خون بہانے پر آمادہ کرتی ہے۔ محبت جس کے لئے تلواروں نے کشتوں کے پشتے لگائے ہیں۔ پریوں کی کہانیوں اور آنسو بھری داستانوں کی محبت۔

یہ سب محض ایک عکس ہے۔

ایک بازگشت ہے۔ ایک واحد ماخذ کی۔ ایک واحد محبت کی، جس سے آپ واقف ہیں، اور میں واقف ہوں، کیونکہ جاننے کے قابل ہونے سے پہلے ہی ہم اسے جان گئے تھے۔ محبت کرنے کے قابل ہونے سے پہلے ہم سے محبت کی گئی تھی۔ دینے کے قابل ہونے سے پہلے یا یہ جاننے سے پہلے کہ دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے، آپ کو دیا گیا تھا۔ یہ وہ محبت ہے جس سے

روشناس ہونے کے لئے آپ کے دل کو پیدا کیا تھا۔ یہ وہ محبت ہے جو ہر محبت کو پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو پہلے تھی...... اور جو ہر چیز کے ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

یہ وہ محبت ہے جو پہلے تھی......اور جو ہر بازگشت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

آج میں نے سکون کی دعا مانگی

آج میں نے خود کو سکون کے لئے دعا مانگتے ہوئے پایا۔
میں ہزاروں بار اپنے ذہن میں داخل ہو چکی اور باہر نکل چکی
میں جانتی ہوں کہ تو نے میری دعا سن لی۔
میں جانتی ہوں کہ میں اس کمرے میں اکیلی نہ تھی
خوف کے خوف سے کانپتی ہوئی،
اعصاب شکن تنہائی کے (خوف سے)۔
میں نے ہاتھوں پہ گر کے تجھے پکارا، گھٹنوں پہ گر کے
چہرہ زمین پہ رکھ کے۔
اگر میں اس سے نیچے جا سکتی تو قسم کھاتی ہوں کہ ضرور جاتی
کیونکہ یہ حقیقی ترین بے چارگی ہے......
ویسی بے چارگی جو کچھ نہیں جانتی، کوئی پتہ، کوئی آنسو، کوئی مسکراہٹ
اس ذات (باری تعالیٰ) کے بغیر نہیں ہو سکتی۔
آج میں نے کچھ سیکھا۔
پھر سے۔
یہ دنیا ہے۔ دنیا۔ آسانی کی جگہ نہیں۔ محض چمک دمک ہے۔
جہاں آپ کو ٹھنڈ اور بھوک ستاتی ہے۔
جہاں آپ کو خوف اور پریشانیاں ستاتی ہیں۔
جہاں سب سرد پڑ جاتا ہے۔

اتنا سرد، کبھی کبھی۔

جہاں آپ کو اپنے پیاروں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

جہاں وابستگی اختیار نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اگر وابستگی ہو بھی جائے تو باقی نہیں رہتی، جب باقی نہیں رہتی تو تکلیف ہوتی ہے۔

جہاں خوشی اور غم محض اداکار ہیں، ڈرامے کے اگلے مکالمے کے منتظر......

سٹیج پر اپنی جگہ کے لئے لڑتے ہوئے۔

جہاں کشش ثقل آپ کو گراتی ہے اور کمزوری آپ کا خون بہاتی۔

جہاں اداسی کا وجود ہے، کیونکہ اسے ہونا ہی ہے۔

اور آنسو گرتے ہیں آپ کو ایک ایسی جگہ کی یاد دلانے کے لئے جہاں آنسو نہیں ہوتے۔

جہاں ان کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

اور کیا یہی بات نہیں؟

کیا جنت ہی وہ جگہ نہیں؟

جس کا ذکر اللہ بار بار دو حوالوں سے کرتا ہے:

''نہ انہیں وہاں خوف ہوگا اور نہ غم۔''

لیکن میں اب بھی یہی ہوں، ہے نا؟

میرے جسم پر زخم کا نشان مجھے اس کی یاد دلاتا ہے۔

میرے بازو پر پڑنے والا چھالے کا نشان رہ گیا جس سے مجھے محبت ہے۔

مجھے اس سے محبت ہے کیونکہ یہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں کتنی کمزور ہوں۔

انسان ہوں۔

یہ کہ میں جلتی ہوں۔ یہ کہ میرا خون بہتا ہے۔ یہ کہ میں ٹوٹتی ہوں۔ یہ کہ میرے جسم پر زخموں کے نشان پڑتے ہیں۔

ہاں۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں گرتی ہوں۔ میں یہاں آنسو بہاتی ہوں۔

یہاں، اس کے باوجود، تو نے یہ کمرہ بھر دیا، اور مجھے اٹھا کر عاجزی کے درجے تک

پہنچایا، اور میری اپنی بے چارگی کا اور تیری اشد ضرورت کا گہرا احساس دلایا۔
اور پھر تو نے اس کا خیال رکھا۔
یقیناً رکھا۔
یقیناً۔
یونس علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی طرح۔ تو نے اس کا خیال رکھا۔
تو سکون والوں کا سکون ہے۔
طاقتوروں کی طاقت ہے۔
جھوٹ کے اس طوفان میں صداقت کا مینارۂ نور ہے۔
لہٰذا آج میں خود کو سکون کے لئے دعا مانگتے ہوئے پاتی ہوں۔

زندگی کی کشمکش پر

آج میں نے تیرے بارے میں سوچا
میں نے تیرے بارے میں سوچا اور وہ الفاظ یاد کئے جو تو نے مجھے بتائے تھے
سب سے بہترین انداز میں۔
تو نے میرے دھڑکتے دل کو پُرسکون کیا
اور میرے سانسوں کو ہموار کیا
تو نے مجھے وہ الفاظ بتائے اور میں اب بھی انہیں ساتھ رکھے ہوئے ہوں
یہ مجھے ہمت دیتے ہیں، میرے خالی پن کا علاج کرتے ہیں، میرے شکستگی کا ازالہ
کرتے ہیں
کیونکہ تکلیف سے زیادہ، میں تھکن کی شکار ہوں
مجھے لگتا ہے میں یہ کہانی ہزاروں سال سے جیتی چلی آ رہی ہوں
اور اب میں سونے کے لئے تیار ہوں
میں بندھن توڑ دینے کو تیار ہوں
میں کہانی کے فوری انجام کے لئے تیار ہوں

میں تیرا سکون محسوس کرنے کے لئے تیار ہوں

اور تیری آواز کا آہنگ

جو مجھے یہ بتائے کہ میرا کام ختم ہوا، میں جیت گئی، میں پہنچ گئی

لیکن میں جانتی ہوں میں اس جگہ کو جانتی ہوں

میں یہاں پہلے بھی آ چکی ہوں

اب میں سونے والی ہوں

میں سونے والی ہوں

ازراہِ کرم مت پوچھنا

ازراہِ کرم مت پوچھنا

بس مجھے سونے دے

بس مجھے اس حال میں سونے دے کہ تیرے لفظ میری زبان پر ہوں:

''اے انسان! تو اپنے رب کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے،

اور اس سے ملنے والا ہے۔'' (سورہ الانشقاق:٦)

سکوت

صبح سویرے سورج کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ یہ درختوں کے ساتھ کچھ ایسا کر دیتا ہے جو آپ کو دن کے کسی اور وقت میں نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے ہم سب ایک ہی چیز چاہتے ہیں: سکوت بھرا سکون۔ شاید اس کا ایک لمحہ ہی، ہم اپنی آنکھیں بند کرنا اور پُرسکون ہونا چاہتے ہیں۔

ایک لمحے کے لئے بھی، پریشانیوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، دکھوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ان چیزوں کی خواہشات سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جو ہمارے پاس نہیں یا ہمیں مل نہیں سکتیں۔ بس سکون کرنا چاہتے ہیں۔ ساکت۔ صامت۔ اندر سے۔ شاید دن کے اس وقت کی یہی بات سب سے خوبصورت ہے: سکوت۔

اور یہ امید کہ شاید یہ دن مختلف ہوگا۔

موت سے پہلے مر جاؤ

مجھ سے گم ہو جانے کو کہہ

مجھ سے کہہ کہ میں گم ہو سکتی ہوں تیری حضوری میں

حقیقی بندگی کے مغلوب کر لینے والے لمحے میں

مجھ سے کہہ کہ میں ہمیشہ کے لئے شکستہ رہ سکتی ہوں

تیری ذات میں

تیرے لئے

تیرے ساتھ۔

مجھ سے کہہ کہ میں ہمیشہ کے لئے یہاں رہ سکتی ہوں

دور رہتے ہوئے بھی یہاں۔

کیا رسول اللہ (ﷺ) نے نہیں کہا تھا: ''موت سے پہلے مر جاؤ''؟

پہلے میں نے سمجھا کہ شاید یہ محض ایک یاد دہانی تھی

تیرے ساتھ اپنی ملاقات یاد رکھنے کی

لیکن پھر میں نے سوچا کہ مجھے اپنی موت سے پہلے مرنے کی کتنی خواہش تھی:

ایسی روح پانے کی جو اس زندگی سے آزاد ہو چکی ہو، خواہ جسم اب بھی یہیں ہو۔

ایسا دل پانے کی جو دنیا کی زنجیروں سے آزاد ہو چکا ہو، خواہ قدموں کو اب بھی اس کی گلیوں میں گھومنا ہو۔

ایسا نفس پانے کی جو پوری طرح سے پُرسکون اور اپنے اللہ سے پوری طرح مطمئن ہو جبکہ بھر بھراتا ہوا خول باقی ہو۔

ایک ایسی روح کی جو پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہو، وہاں پہنچنے سے پہلے ہی۔

ایک روح جو کسی سے وابستہ نہ ہو۔

ایک نفس مطمئنہ...... سب سے سچے اور سب سے گہرے اور سب سے حقیقی مفہوم میں

(سورہ الفجر: ۲۷)

کیونکہ، جیسا کہ عظیم عالم نے کہا تھا: ''جو اس دنیا کی جنت میں داخل نہیں ہوتا، وہ اگلے جہان کی جنت میں بھی داخل نہیں ہوگا۔''

مجھے بچا لے

تیری کشادہ دلی کے سوا میری کوئی جائے امید نہیں...... کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ میں تیرے در پر شکستہ ٹکڑے لئے کھڑی ہوں...... اور پھر بھی تو دروازہ کھول دیتا ہے۔ مجھے اس طوفان سے بچا لے۔ میں تیرے بندوں میں سب سے زیادہ لاچار ہوں۔ اور میں راہ گم کر چکی ہوں، جنگل کے وسط میں بھٹکتی ہوئی رستہ تلاش کر رہی ہوں۔ لیکن سب درخت ایک جیسے لگتے ہیں، اور ہر راستہ واپس ابتدا کی طرف لے جاتا ہے۔ اس جنگل سے نکلنے کا راستہ کسی کو نہیں ملتا...... ماسوائے ان کے جنہیں تو بچا لے۔ مجھے بچا لے...... کیونکہ سچ یہی ہے کہ میں خود کو نہیں بچا سکتی۔

میرا دل ایک کھلی کتاب ہے

میرا دل ایک کھلی کتاب ہے
جو میری کہانی کے صفحے پر کھلا ہوا ہے۔
انہیں بتاؤ کہ تم نے سبق سیکھ لیا۔
تم ہر بار اسے سیکھو گے،
تم نامکمل میں تکمیل ڈھونڈتے ہو۔
تم نے تنکوں کے آشیاں میں جائے پناہ ڈھونڈی
پھر جب طوفان آیا،
تم عریاں اور تنہا تھے۔
بے سائباں۔
تم سالوں نگلتے رہے......
مگر یہ محض ہوا تھی۔
اور تم حیران ہوتے رہے کہ تمہارا قلب خالی کیوں ہے۔

انہوں نے تمہیں کہانیاں سنائیں
اور تم نے ان پر یقین کرلیا......
پھر پری کا انتظار کرتے رہے
کہ وہ تمہارے لئے ریزگاری لائے۔
اور اس کے باوجود تم سب کچھ قربان کردو گے
کہانی کو حقیقت بنانے کے لئے۔
چھوڑ دو اسے۔
ایک بہتر کہانی موجود ہے۔
جو کہ کہانی نہیں ہے۔
یہ حقیقت ہے۔
مگر اس میں ہیرو کبھی مرتا نہیں
اس کا خون نہیں بہتا اور وہ روتا نہیں
حقیقی شکل ڈھونڈ لو۔
اسے یاد کرلو۔
اسے اپنے دل پر لکھ لو۔
اور پھر،
یہ دنیا کو دو پڑھنے کے لئے۔
تمہارا دل ایک کھلی کتاب ہے۔

گھاؤ

گھاؤ کا غم نہ کرو۔
اس کا مقصد محض تمہیں آزادی دلانا ہے۔
ان زنجیروں سے جو تمہیں زمین سے باندھے ہوئی ہیں
اور تمہیں لوگوں کی پرچھائیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔

پانی کا سراب پیاس نہیں بجھا سکتا۔
مگر پیاسے کو بہت خوبصورت لگتا ہے۔
میں خوفزدہ ہوں۔اس سے کہ مجھے کسی اور زندگی سے شناسائی حاصل نہ ہوگی۔
مختلف۔بہت مختلف۔
اگر میں بندھن توڑ دوں تو کیا تم مجھے اور اوپر لے جاؤ گے؟
غم،طمع،محرومی سے اوپر۔
میرے علم میں آنے والی ہر چیز سے اوپر۔
مجھے اور اوپر لے جاؤ۔زمین سے میرا بندھن توڑ دو۔
ویکسین کی طرح، یہ تمہیں بیمار بناتا ہے،تمہاری طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے۔
گھاؤ عارضی ہے۔آزادی ہمیشہ رہنے والی ہے۔

مناسب جگہ

میری ہڈیاں پگھلنا چاہتی ہیں۔
میرے عضلات جدا ہونا چاہتے ہیں
میرا جسم بند کر دینا چاہتا ہے
چلنا
ہاتھ پاؤں مارنا
لڑنا
ہوا کے لئے
زندگی کے لئے
میرے ذہن نے میرے لئے ایک تصویر بنائی،
لیکن اب سیاہ وسفید ہو چکی ہے۔
درخت خمیدہ ہیں، مرجھائے ہوئے ہیں، بند ہیں۔
میرے دل کا بھی یہی حال ہے

لیکن اب بھی، میرے خیالات بولتے رہتے ہیں،
چلتے رہتے ہیں،
ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں،
لڑتے رہتے ہیں،
ہوا کے لئے،
زندگی کے لئے۔
اتنی واضح تصویر تم کیسے مٹا سکتے ہو؟
اتنی حقیقی؟
مجھے بتاؤ کہ خود کو اس میں سے کیسے مٹاؤں،
اور اپنے تھکے ہوئے پیروں کو آرام دوں۔
میں دیکھتی ہوں
میں لڑکھڑا رہی ہوں،
چل نہیں رہی۔
اب میں ٹھوکر کھا رہی ہوں
بول نہیں رہی۔
میرے سینے میں ایک درد ہے
جس نے خاموشی، غم، بے چینی سے جنم لیا ہے
اس کا دعوے دار میرے سوا کون ہے؟
میرے سوا اسے نام دینا کون جانتا ہے؟
مجھے اپنی بے حسی پر افسوس ہے،
بوقت فجر اپنی کاہلی پر۔
اب میں جنگلوں میں چکرا رہی ہوں
اپنی جگہ کی تلاش میں۔

کیا مجھے شرحِ صدر ہوا ہے؟
میں کس کی آواز سن رہی ہوں؟
میری اپنی آواز تیکھی اور بہرہ کر دینے والی ہے۔
اور کون میرے نام سے واقف ہو سکتا ہے؟
صرف اس ذات کی مہربانی کی بدولت
دل بول سکتا ہے
جب ذہن اور جسم شل ہو چکے ہوں
صرف گھسٹ رہے ہوں۔
ازراہِ کرم آؤ،
خواہ صرف میرے خیالات کو خاموش کرانے کے لئے ہی سہی۔
میں جنگلوں میں چکرا رہی ہوں
اڑتی ہوئی
اب بھی اپنی جگہ کی تلاش میں
میں اب
چل نہیں رہی،
ہاتھ پاؤں نہیں مار رہی،
لڑ نہیں رہی۔
میں نے ہوا حاصل کر لی ہے
میں نے اپنی زندگی حاصل کر لی ہے۔

چلے چلو

ہر روز میں ہماری ملاقات کے نزدیک پہنچتی ہوں
مجھے لگتا ہے میں اس راستے پر ہزار سال سے چل رہی ہوں
تیری طرف......

اور اب بھی منزل نہیں آئی۔
اتنے پاس، اور پھر بھی اب تک اتنی دور
مگر میں چلتی رہتی ہوں،
آنسوؤں کے باوجود،
ہواؤں کے باوجود،
چھلے ہوئے گھٹنوں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے باوجود،
چوٹوں اور زخموں کے باوجود جنہوں نے اس دل کو اس کی موجودہ شکل دی ہے
میں چلتی رہتی ہوں......
تیری طرف۔
صرف ایک سمت ہے، ایک سمت:
تیری طرف۔
تیری طرف سے تجھ تک۔
میرے پاس اور کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔
یہ میری غربت ہے۔ میں چلتی رہتی ہوں
کیونکہ ہر غروب کے پیچھے ایک طلوع ہے،
ہر طوفان کے پیچھے ایک جائے پناہ ہے،
ہر نشیب کے پیچھے ایک فراز ہے،
ہر آنسو کے پیچھے آنکھوں کی تطہیر ہے۔
اور جہاں جہاں آپ کو گھاؤ لگے ہیں،
وہاں اندمال ہوا ہے،
اور پہلے سے مضبوط کھال پیدا ہوئی ہے۔
میں چلتی رہتی ہوں
کیونکہ واللہ میرے پاس کچھ نہیں سوائے تیری رحمت کے۔

میرے پاس کچھ نہیں سوائے تیرے وعدے کے

تیرے لفظ

تیرا وعدہ کہ:

''اے انسان! تو اپنے رب کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے، اور اس سے ملنے والا ہے۔'' (سورہ الانشقاق:٦)

یاسمین مجاہد کی کتاب

Reclaim Your Heart

خدا تک کا سفر

- انسان کا حقیقی سفر۔
- اللہ سے قربت کا سفر۔ اپنے مالک کی طرف کا سفر۔
- ایک ایسا سفر جس کا مسافر ہر قسم کی پریشانی، مصیبت، ڈپریشن،
- دکھ درد سے آزاد ہو جاتا ہے۔
- ایک ایسا سفر جو آپ کو اطمینان قلب عطا کرتا ہے۔
- راحت، خوشی، کامیابی و کامرانی اور آزادی کا سفر۔
- خدا تک کا سفر۔۔۔۔
- سفر جو ذہن کو وسیع کرتا ہے، دل کو اطمینان دیتا ہے،
- کامیابی کے راستے کھولتا ہے۔
- شکستہ زندگی سے خوشگوار زندگی کا سفر۔
- قریب سے اقرب کا سفر۔
- دل گرفتہ، پریشان حال لوگوں کے لیے امید اور خوشی کا سفر۔

an artwork by ARTWORKS INTL.
Kh.Afzal Kamal - 0320 - 4031556

Rs.800/-

DUA PUBLICATIONS
Al-Hamd Market, Urdu Bazar,
Tel: 042-37233585 | Cell: 0300-9476417
Email: duapublications@gmail.com

176, Basement, Ali Market,
Opp. Bible Society,
New Anarkali, Lahore Pak.
Cell: 0092 309 5005471